



چنڈی گڑھ تک

(سفرنامہ)

محمد اطہر مسعود









چندی گڑھ تک

(سفر نامہ)

چندی گڑھ تک

(سفر نامہ)

محمد اطہر مسعود

فکشن ہاؤس
○ لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب	:	چندی گڑھ تک (سفرنامہ)
مصنف	:	محمد اطہر مسعود
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن ہاؤس کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	-/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ، 68- مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: 042-36307550-51,37249218

فکشن ہاؤس: 53-52 رابعہ سکوائر، حیدر چوک، حیدر آباد۔ فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور، دوکان نمبر 5، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

○ لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

تہذیب و شائستگی کے پیکر اور فنون لطیفہ کے شیدائی

قاسم جعفری

کے نام، جو میرے اولین سفر ہندوستان میں شریکِ سفر تھے

فہرست

سنجن نگر سنگیت سمیلن

لاہور میں سنجیدہ موسیقی کی ترویج کے حوالے سے سنجن نگر انسٹیٹیوٹ آف فلاسفی اینڈ آرٹس (SIPA) کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے فنونِ لطیفہ کی مختلف شاخوں بالخصوص کلاسیکی موسیقی کے فروغ کے لیے اس ادارے نے خاصا کام کیا ہے۔ اس کے روح رواں رضا کاظم پیشے کے اعتبار سے قانون دان ہونے کے باوجود موسیقی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اچھی آوازوں کی معیاری ریکارڈنگ ان کا جنون ہے۔ اس کے علاہ روایتی سازوں کی ساخت کے حوالے سے بھی وہ نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ سنجن نگر کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی محافل موسیقی تعداد میں کم سہی لیکن معیار کے اعتبار سے پاکستان بھر کی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کے تحت منعقد ہونے والے موسیقی کے پروگراموں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں۔ عموماً غیر ممالک سے آئے ہوئے فنکاروں کے اعزاز میں منعقدہ ان محافل میں اکا دکا مقامی فنکاروں کو بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جس سے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات میں پیش رفت اور موسیقی کے میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کے بڑے خوبصورت مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں۔

پچھلے بارہ پندرہ برس کے دوران مجھے سنجن نگر کے زیر انتظام منعقد ہونے والے کم از کم تین ایسے پروگراموں میں شرکت کا اتفاق ہو چکا ہے جو فن موسیقی کی ترویج

نیز اپنی معیاری پیشکش کے حوالے سے تاریخی حیثیت کے حامل تھے۔ ان میں سے ایک پروگرام وائس آف امریکہ سے وابستہ امریکی ستار نواز برائن سلور کے ساتھ ایک شام تھی جب کہ باقی دونوں پروگرام ہندوستان سے آئے ہوئے فنکاروں کے اعزاز میں ترتیب دیے گئے تھے۔ ایک پروگرام میں دھرپد گائیکی کے حوالے سے مشہور ڈاگر خاندان کے فرزند استاد واصف الدین ڈاگر اور دوسرے میں بیسویں صدی میں ٹپہ گائیکی کے لیے مشہور سدھیشوری دیوی (۱۹۰۷-۱۹۷۶ء) کی صاحبزادی سویتا دیوی نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۰ء تک بسلسلہ ملازمت دوسرے شہروں میں تعیناتی کے باعث لاہور کی ثقافتی زندگی سے میرا تعلق اس موضوع پر اخباری خبریں پڑھنے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ۲۰۱۱ء میں لاہور واپسی کے بعد تجدیدِ تعارف یا یوں کہیے کہ علمی، ادبی اور ثقافتی حوالے سے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلانے میں تقریباً ایک ڈیڑھ برس کا عرصہ لگ گیا۔

چنانچہ مارچ ۲۰۱۴ء میں سنجن نگر سنگیت سمیلن کا دعوت نامہ ملا تو بڑی خوشی ہوئی کہ ایک عرصے بعد لاہور میں ہندوستان سے آئے ہوئے فنکاروں کو سننے کا موقع ملے گا۔ سات سے نو مارچ تک جاری رہنے والے اس سمیلن کے پروگرام کو دیکھ کر خوشگواری کا احساس یوں بھی زیادہ ہوا کہ پہلے دو دن پروگرام شام کو اور تیسرے دن یعنی اتوار کو صبح کی نشست طے تھی، وگرنہ ہمارے ہاں تو معمول یہی ہے کہ اس نوعیت کے پروگرام صرف شام ہی کے وقت منعقد ہوتے ہیں۔

سنجن نگر سنگیت سمیلن کا یہ پروگرام بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ پہلے دن ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان فنکاروں اور حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے رضا کاظم نے ضمناً ان مشکلات کا بھی ذکر کیا جو انھیں اس حوالے سے پیش آئیں، نیز سنجن نگر

سے وابستہ اپنے ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے کئی ماہ تک دن رات کام کر کے اس کا انعقاد ممکن بنایا۔ سعدیہ طارق اور ارم توقیر ایک طویل عرصہ سے سنجن نگر کے ساتھ بطور سینئر ریسرچر منسلک ہیں اور اس کے علاوہ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے منعقد ہونے والے پروگراموں کی ترتیب میں رضا کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ نور زہرہ کاظم میوزیکالوجسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے والد رضا کاظم کی اختراع کردہ وینا بجاتی ہیں اور پاکستان اور دیگر ممالک میں متعدد بار اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ رضا کاظم کے نواسے راکع رحمٰن جمیل ستار بجاتے ہیں اور ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ موسیقی سے بطور استاد وابستہ ہیں۔

رضا کاظم نے یہ بھی بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے کس طرح دہلی میں منعقدہ ایک میوزک کانفرنس کے دوران ان کی ملاقات ''بانوے سالہ نوجوان'' نوجیون کھوسلا سے ہوئی اور مشترک دلچسپیوں کی بنا پر وہ کتنی جلد گہرے دوست بن گئے۔ دہلی میں قیام کے دوران ہی ''سنجن نگر انسٹیٹیوٹ آف فلاسفی اینڈ آرٹس، لاہور'' اور ''انڈین نیشنل تھیٹر، چنڈی گڑھ'' کے باہمی اشتراک سے لاہور اور چنڈی گڑھ میں موسیقی کے پروگرام ترتیب دینے کی تجویز پر بھی بات ہوئی اور طے پایا کہ دونوں ادارے سال میں ایک مرتبہ اپنے سمیلن میں دوسرے ملک کے فنکاروں کو مدعو کیا کریں گے۔

انڈین نیشنل تھیٹر چنڈی گڑھ کے سالانہ پروگرام کی روایت تو خاصی مستحکم ہے اور ۲۰۱۳ء میں وہ اپنا چھتیسواں سمیلن منعقد کرنے والے تھے جس میں پاکستان سے فنکاروں کو مدعو کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ یہ کام ۲۰۱۴ء میں ہونے والے سینتیسویں سنگیت سمیلن تک اٹھا رکھا گیا۔ اس پر رضا کاظم نے تجویز پیش کی کہ وہ آئندہ مارچ یعنی ۲۰۱۴ء میں ''سنجن نگر سنگیت سمیلن'' کے عنوان سے اس سلسلے کا پہلا پروگرام لاہور میں منعقد کر لیتے ہیں جس میں انڈین نیشنل تھیٹر کے تعاون سے کچھ بھارتی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ

کریں۔ کھوسلا صاحب کے لیے اس تجویز سے اتفاق کرنے میں کیا امر مانع ہوسکتا تھا؟ فوراً ہامی بھرلی اور ہندوستانی فنکاروں سے رابطے شروع کر دیے۔ سنجن نگر نے پروگرام کی تاریخیں فائنل کیں تو انھوں نے بھی فنکاروں کی آمد اور دیگر انتظامات کو حتمی شکل دے دی اور ویزے وغیرہ کے مراحل سے نمٹ کر انڈین نیشنل تھیٹر کی سیکرٹری ونیتا گپتا، دیبو پریا بانسری نواز، شریمتی پیو سرخیل، پنڈت ودیا دھرویاس اور ڈاکٹر کلیانی دیش مکھ کے ہمراہ پروگرام سے دو دن پہلے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور سمیلن کے پہلے روز رضا کاظم کی خیر مقدمی گفتگو کے بعد نوجیون کھوسلا صاحب نے بھی مختصر بات چیت کی اور لاہور کے حوالے سے اپنی یادوں کو تازہ کیا۔ تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان میں لاہور کی ثقافتی اہمیت پر بڑی دلگداز باتیں کیں اور امید ظاہر کی کہ ان کے ادارے ''انڈین نیشنل تھیٹر، چندی گڑھ'' اور ''سنجن نگر انسٹیٹیوٹ آف فلاسفی اینڈ آرٹس، لاہور'' کے درمیان شروع ہونے والا یہ ثقافتی اشتراک ہمیشہ جاری رہے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انڈین نیشنل تھیٹر، چندی گڑھ کا سالانہ سنگیت سمیلن ہر سال اکتوبر کے آخری ہفتے میں منعقد ہوتا ہے۔ آپ میں سے جو لوگ اس میں شرکت کرنا چاہیں وہ میرے ذاتی مہمان ہوں گے۔

سنجن نگر سنگیت سمیلن کے پہلے دن پروگرام کا آغاز ارم توقیر نے لکھنوی انداز کی ایک پرانی بندش گا کر کیا جس کے بعد انڈین نیشنل تھیٹر کی سیکرٹری ونیتا گپتا اور پھر بانسری نواز دیبو پریا نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ شام ساڑھے چھے بجے کے قریب شروع ہونے والی یہ نشست تقریباً رات دس بجے تک جاری رہی۔

دوسرے روز پرفارمنس کی ابتدا راکع رحمٰن جمیل سے ہوئی جنھوں نے سُر بہار پر راگ بھیم پلاسی پیش کیا۔ اس کے بعد شریمتی سرخیل اور پنڈت ودیا دھرویاس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور لاہور کے شائقینِ موسیقی سے خوب داد سمیٹی۔

تیسرے دن پروگرام کا وقت صبح ساڑھے دس بجے تھا۔ سب سے پہلے نورزہرہ کاظم نے ساگر وینا پر ایک راگ اور پھر دادرا پیش کیا۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق سمیلن کی آخری فنکارہ ڈاکٹر کلیانی دیش مکھ نے پرفارم کرنا تھا لیکن کھوسلا صاحب نے مائیک پر آکر دیبو پریا کو دعوت دی کہ وہ بانسری پر کوئی راگ سنائیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا کہ Flute Sisters کے نام سے معروف دیبو پریا اور سچمیتا اکٹھا پرفارم کرتی ہیں لیکن سچمیتا ویزا نہ ملنے کے باعث تشریف نہیں لاسکیں۔ اتنے میں دیبو پریا سٹیج پر بیٹھ کر تانپورہ ملا چکی تھیں۔ اور یہ بھو طبلہ نواز بھی اپنا طبلہ سُر کر چکے تھے۔ دیبو نے پہلے شدھ بھیروں کا خیال اور بعد ازاں مشر کھماچ میں دادرا پیش کیا۔ صوت اور صورت دونوں کے حسین امتزاج سے عبارت اس پرفارمنس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا۔

سنجن نگر سنگیت سمیلن کی آخری فنکارہ ڈاکٹر کلیانی دیش مکھ تھیں جنھوں نے راگ نٹ بھیروں کا خیال پیش کیا۔ ڈاکٹر کلیانی جی کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ وہ موسیقی نہیں بلکہ نفسیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور مہاراشٹر سٹیٹ یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی سربراہ رہ چکی ہیں لیکن موسیقی کے میدان میں ان کی شناخت جداگانہ ہے اور ان کا شمار کلاسیکی موسیقی سے وابستہ ہندوستان کے سینئر فنکاروں میں ہوتا ہے۔ اُس روز انھوں نے جس عمدگی سے نٹ بھیروں گایا، وہ انھی کا حصہ ہے۔ میرے ساتھ حاضرین میں بیٹھے ہوئے لاہور کے جانے مانے ناقدینِ موسیقی کا خیال تھا کہ یہ راگ مدت ہوئی کم از کم پاکستان میں کسی سے سنا ہی نہیں اور آج اِن سے سنا ہے تو لطف آ گیا۔ نٹ بھیروں کے بعد ڈاکٹر کلیانی نے جونپوری کی ایک مختصر بندش بھی سنائی۔

ڈاکٹر کلیانی کی پرفارمنس کے بعد سمیلن کے باقاعدہ اختتام کے اعلان سے پہلے نوجیون کھوسلا صاحب مائیک پر تشریف لائے اور تجویز پیش کی کہ سب فنکار پنڈت ودیادھر ویاس کی قیادت میں گرونانک جی کی مشہور بانی ''سادھو من کا دھیان تیاگو...'' گا

کر اس تین روزہ سمیلن کا اختتام کریں۔ جتنی دیر میں سب فنکار سٹیج پر جا کر بیٹھے اور ساز وغیرہ سُر ہونے لگے، کھوسلا صاحب نے بتایا کہ امن، رواداری اور انسان دوستی سے عبارت اس بانی کو آنجہانی پنڈت وشنو ڈگمبر پلوسکر (۱۸۷۲-۱۹۳۱ء) نے راگ میاں کی ملہار میں کمپوز کیا ہے جسے میں نے برسوں پہلے پنڈت ودیادھر ویاس کے والد پنڈت نارائن راؤ ویاس (۱۹۰۲-۱۹۸۴ء) سے سنا تھا۔ حاضرین نے اس عمدہ تجویز کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا بلکہ اکثر تو اپنی نشستوں سے اٹھ کر پنڈت جی اور دیگر فنکاروں کے ہم آواز ہو گئے اور یوں تین روزہ سجن نگر سنگیت سمیلن (۷ تا ۹ مارچ ۲۰۱۴ء) اتوار کے روز بعد دوپہر اپنے اختتام کو پہنچا۔

برِ صغیر پاک و ہند میں کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے لاہور کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ سجن نگر سنگیت سمیلن کے باعث اہلِ لاہور ایک عرصے بعد اتنے زیادہ بھارتی فنکاروں کی پرفارمنس سے لطف اندوز ہوئے تھے۔ دوسری طرف فنکاروں کے چہروں پر موجود مسرت بھی دیدنی تھی۔ ہر آرٹسٹ نے سٹیج پر بیٹھتے ہی حاضرین سے مخاطب ہو کر اس بات کا اقرار کیا کہ آج اُن کی زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پوری ہو رہی ہے کہ وہ برِ صغیر کے ثقافتی دارالحکومت میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں جہاں خوش قسمتی سے اساتذۂ فن اور عام شائقینِ موسیقی کے علاوہ ناقدین اور محققین غرضیکہ کسی بھی حوالے سے موسیقی سے وابستہ لوگ موجود ہیں۔ اختتامی کلمات میں نوجیون کھوسلا صاحب نے رضا کاظم کی میزبانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہ صرف انھیں بلکہ تمام حاضرین کو ایک بار پھر انڈین نیشنل تھیٹر (چندی گڑھ) کے زیرِ اہتمام اکتوبر ۲۰۱۴ء میں ہونے والے سینتیسویں سنگیت سمیلن میں شرکت کی دعوت دی۔

◆◆◆

بلاوا

انڈین نیشنل تھیٹر کے صدر نوجیون کھوسلا اور ان کے ہمراہ آنے والے فنکاروں نے اپنے خلوص، رواداری اور خوش مزاجی کے باعث سجن نگر سنگیت سمیلن میں شرکت کرنے والوں کی بڑی تعداد کو اتنے مختصر وقت میں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ موسیقی سے میری طالبعلمانہ دلچسپی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستگی کی بنا پر کھوسلا صاحب نے مجھ پر خصوصی توجہ فرمائی۔ سمیلن کے دوسرے روز جب میں اپنے گھر واپس پہنچا تو ان کے ادارے ''انڈین نیشنل تھیٹر'' کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ رات کو ای میل چیک کرتے ہوئے انڈین نیشنل تھیٹر چندی گڑھ کی ویب سائٹ بھی دیکھ ڈالی۔ ارے واہ! یہ تو خاصی بڑی اور پرانی تنظیم ہے اور رقص و موسیقی کے حوالے سے اِس کی خدمات اُس سے کہیں زیادہ ہیں جتنا کھوسلا صاحب اور ان کے ساتھی فنکار اپنی روایتی عاجزی سے بیان کر رہے تھے۔ میں نے یونہی ممبر شپ کا بٹن کلک کر کے ایسی عمدہ ثقافتی تنظیم کا رکن بننے کی درخواست داغ دی۔

یہاں تک تو پہنچے، یہاں تک تو آئے

سجن نگر سنگیت سمیلن کے آخری روز، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، خاصی گرمجوشی کا ماحول رہا لیکن رخصت ہوتے وقت کسی سے بھی انڈین نیشنل تھیٹر کی رکنیت پر بات نہ ہوئی۔ تاہم اٹھارہ مارچ کو مجھے شریمتی ونیتا گپتا، سیکرٹری انڈین نیشنل تھیٹر کی طرف سے

اپنی ای میل کا جواب موصول ہوا جس میں ویب سائٹ دیکھنے اور لاہور میں ہونے والی پرفارمنس کی تعریف پر شکریے کے بعد صرف اتنا کہا گیا تھا کہ انڈین نیشنل تھیٹر کی رکنیت کے لیے آپ کی درخواست مجلسِ عاملہ کی اگلی میٹنگ میں پیش کر دی جائے گی۔

اتنا اطمینان ضرور ہو گیا کہ یہ تنظیم نہ صرف بذریعہ ای میل اپنے دفتری امور نمٹاتی ہے بلکہ رابطہ کرنے والوں کو باقاعدہ جواب بھی دیتی ہے وگرنہ انٹرنیٹ پر موجود اس نوعیت کی بیشتر تنظیموں کی ویب سائٹس پر ایسا تکلف نہیں کیا جاتا؛ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے!

ایسا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

ہندوستان کے سفر کے حوالے سے مشکلات کا ذکر تو بہت سنا اور سفر ناموں وغیرہ میں پڑھا بھی تھا لیکن اِس کا صحیح اندازہ بذاتِ خود اِس کا تجربہ ہونے پر ہی ہوا۔ ہندوستان کے ایک معروف اور معتبر ادارے کے دعوت نامے پر گروپ کی شکل میں سفر اور سنجن نگر انسٹیٹیوٹ آف فلاسفی اینڈ آرٹس (SIPA) کے توسط سے معاملات کی انجام دِہی جیسی ''آسانیوں'' کے باوجود بھی انٹرنیٹ پر ویزا فارم پُر کرنے، درخواست فارم کے ساتھ منسلک ہونے والے کاغذات کی ایک خاص ترتیب میں فراہمی، اپنے ادارے اور پھر وفاقی حکومت کی جانب سے خصوصی این او سی برائے ہندوستان کا حصول اور سب سے بڑھ کر محکمۂ صحت سے پولیو بچاؤ قطرے پی چکنے کا سرٹیفکیٹ لے لینے کے باوجود یہ یقین نہیں آتا تھا کہ حتمی طور پر ویزا مل جائے گا:

محبتوں میں یہی ہے دلوں کو دھڑکا سا
نجانے کون کہاں راستہ بدل جائے

پنجاب یونیورسٹی سے این او سی کے حصول کے لیے درخواست دی تو کسی نے بتایا کہ شعبۂ اردو کے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کافی دفعہ انڈیا جا چکے ہیں، ان سے رہنمائی لینا



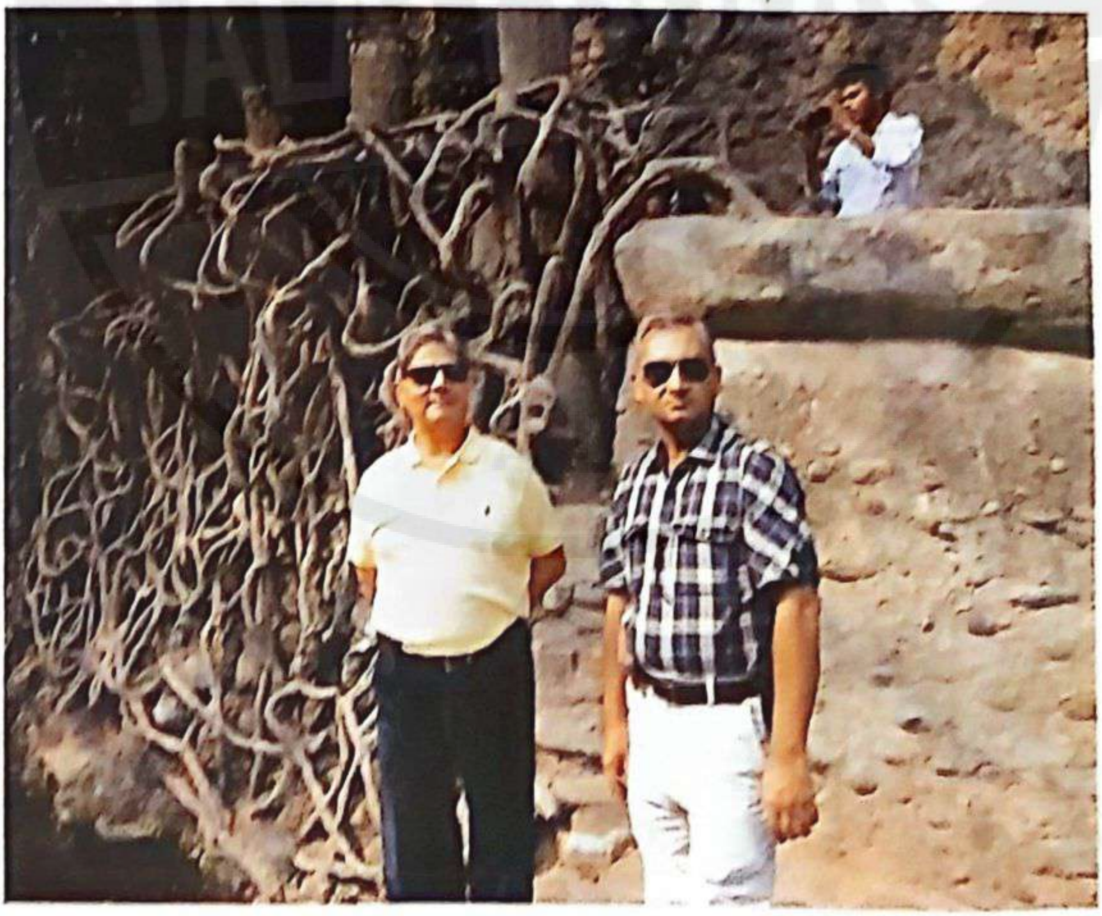
وڈیل مسو اور مصنف (راک گارڈن، چنڈی گڑھ)



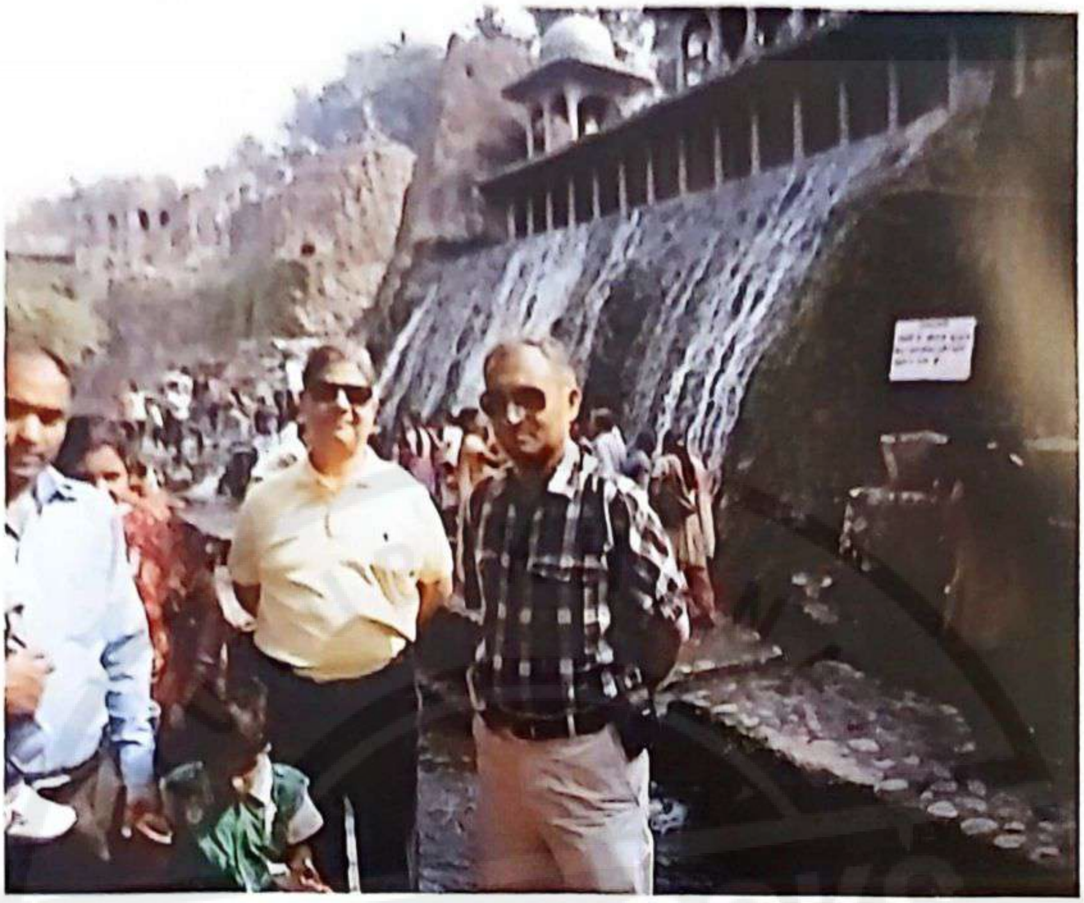
راک گارڈن (چنڈی گڑھ) کا ایک منظر



قاسم جعفری اور وشال کھوسلا (راک گارڈن، چنڈی گڑھ)



مصنف اور قاسم جعفری (راک گارڈن، چنڈی گڑھ)



مصنف اور قاسم جعفری (راک گارڈن، چندی گڑھ)



کھوسلا صاحب کے گھر کھانے کی میز پر (دائیں سے بائیں): وسندھرا، رینو (کھوسلا صاحب کی بہو)، وویک بھارتی، سعدیہ، قاسم جعفری، کھوسلا صاحب، نوجوت، وشال، رشیدہ رضا اور ڈاکٹر غزالہ عرفان



کھوسلا صاحب کھانے کے بعد قاسم جعفری کو سونف چھالیہ پیش کرتے ہوئے



قاسم جعفری اور گڈی آنٹی



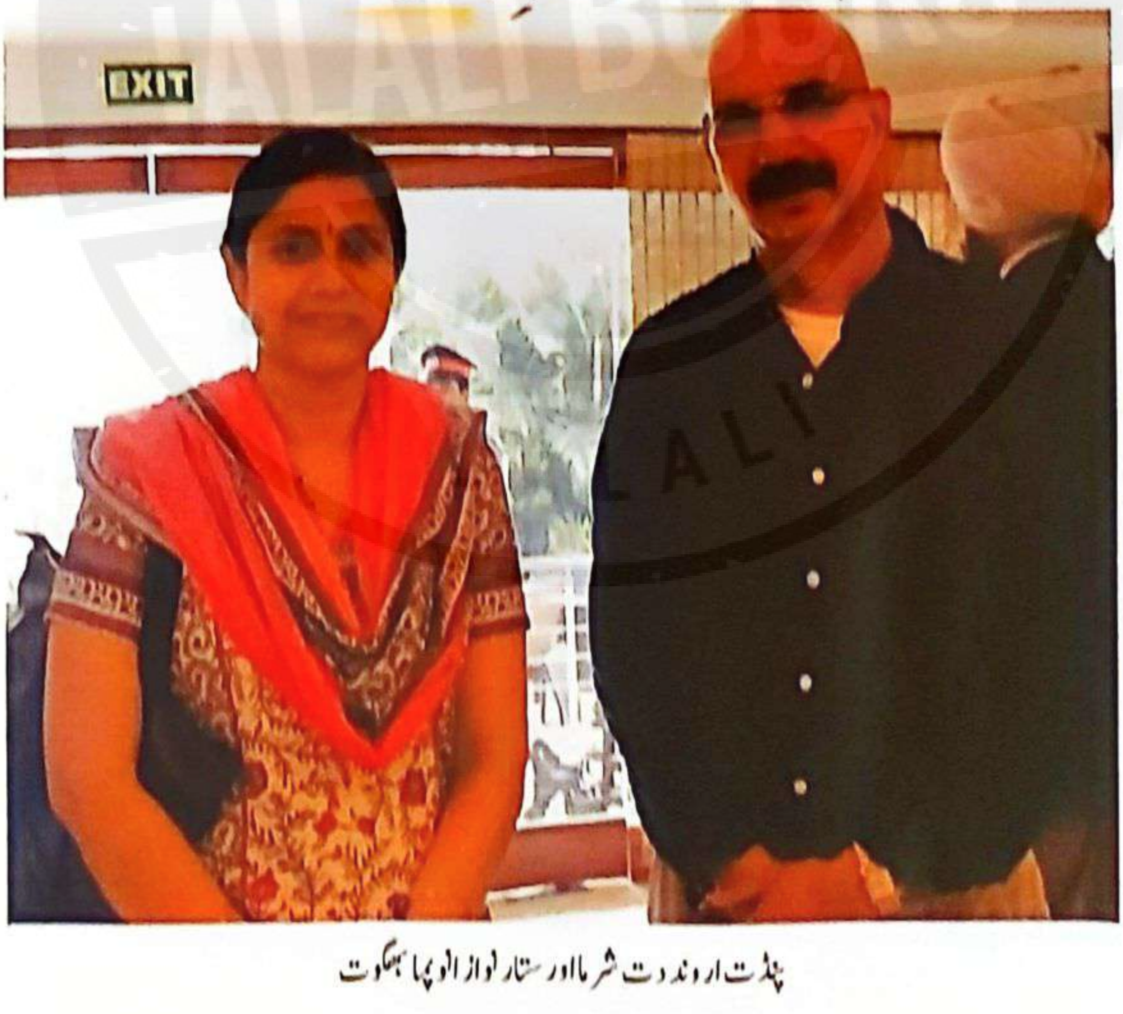
قاسم جعفری اور بریگیڈیر (ریٹائرڈ) گوبندر سنگھ



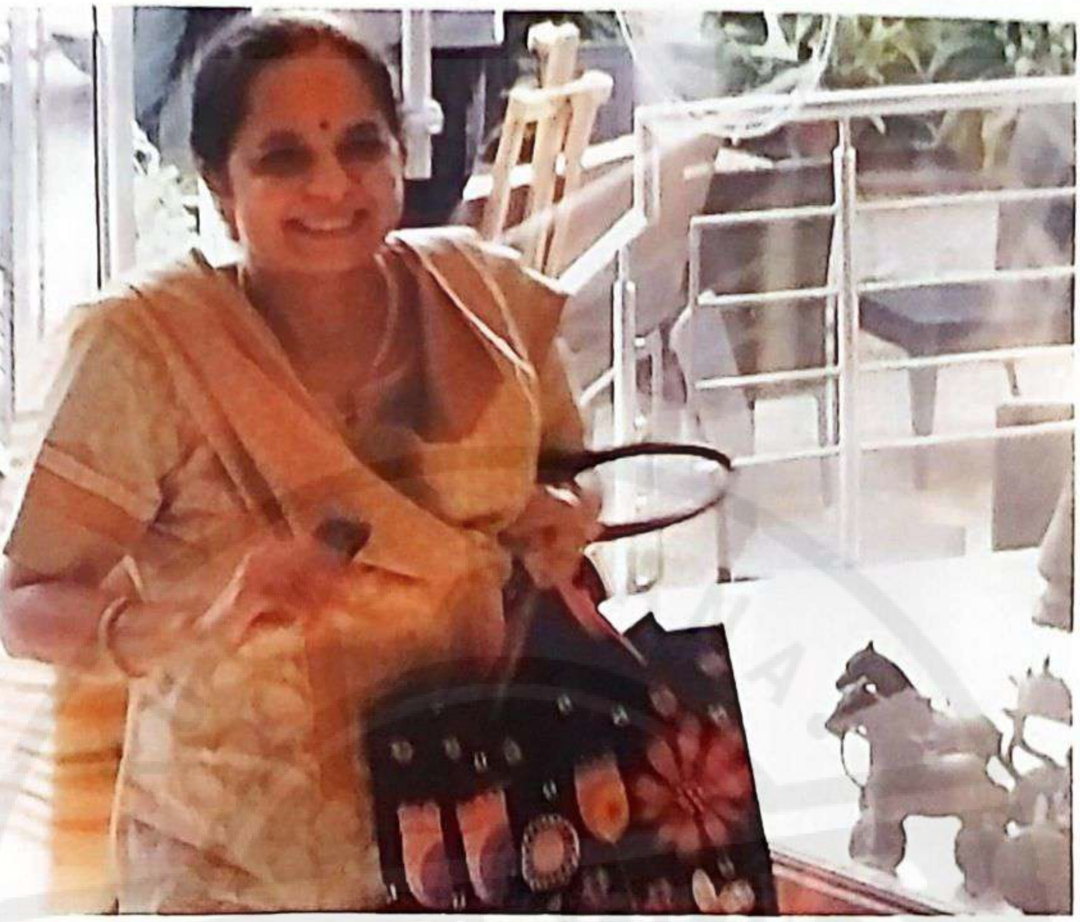
ستار نواز انوپما بھگوت



پنڈت شونیک ابھیشیکی راگ جے جے ونتی پیش کرتے ہوئے



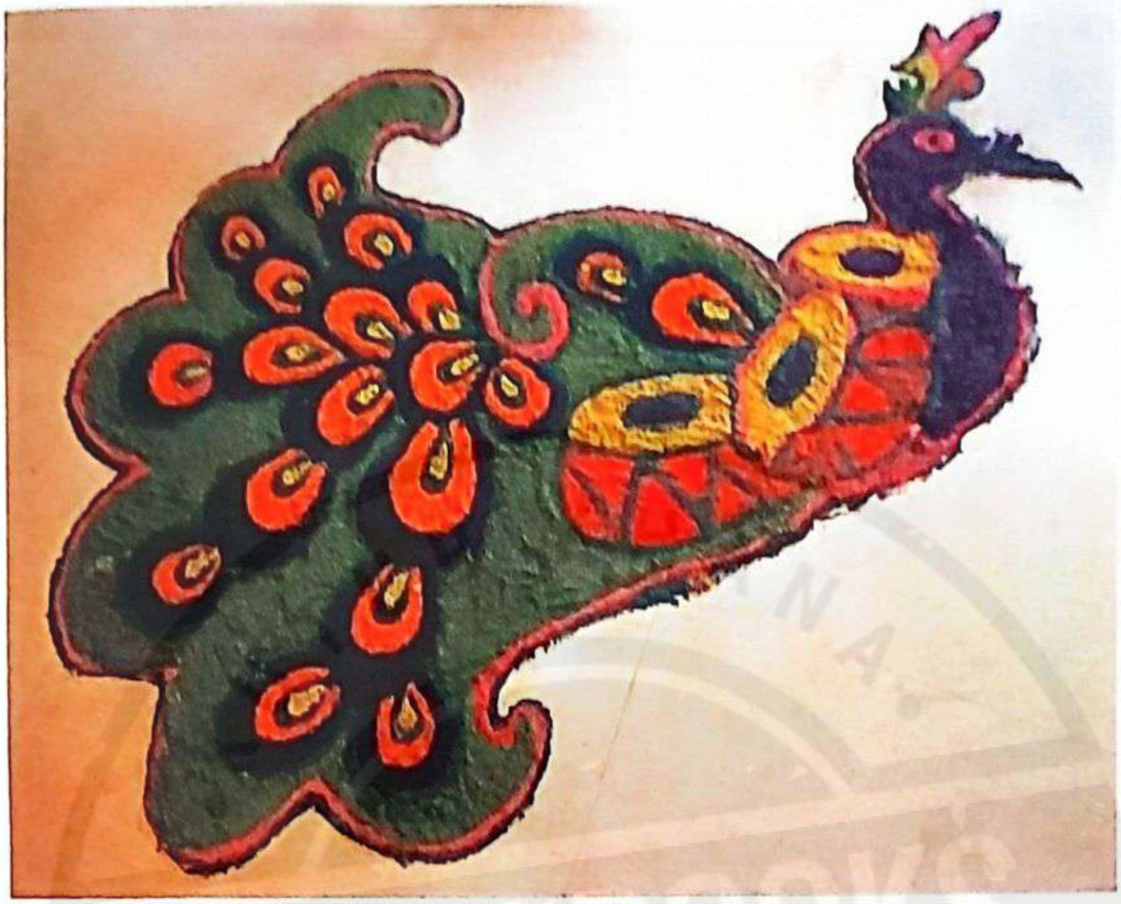
پنڈت اروند دت شرما اور ستار نواز انوپما بھگوت



ونیتا گپتا، سیکرٹری انڈین نیشنل تھیٹر (چندی گڑھ)



دائیں سے بائیں: قاسم جعفری، نوجیون کھوسلا، جنرل مینجر ہوٹل اروما (چندی گڑھ)، دِوِک بھارتی اور مصنف



ہوٹل اروما (چنڈی گڑھ) کی لابی میں بنی خوبصورت رنگولی



مصنف، منجوشا پاٹل کو سٹیج پر جا کر خیر مقدمی تحائف پیش کرتے ہوئے

سود مند ہو سکتا ہے۔ ان سے رابطہ کیا تو موصوف نے واقعی تعاون کا حق ادا کیا۔ انٹرنیٹ پرویزا فارم پُر کرتے ہوئے رات دن جب بھی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے بلا دھڑک انھیں فون کیا اور جواباً انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی اور تحمل کے ساتھ بڑے پر خلوص انداز میں رہنمائی فرمائی۔

دوسری طرف سخن نگر کا دفتری محاذ سعدیہ نے سنبھالا ہوا تھا۔ انڈین نیشنل تھیٹر کی جانب سے وقتاً فوقتاً موصول ہونے والی ای میلز کو تمام مدعوئین تک فارورڈ کرنا نیز دونوں طرف کے سوالات وغیرہ کے بروقت اور تسلی بخش جواب دینے کا مشکل کام جس خوبی اور معاملہ فہمی سے انھوں نے انجام دیا، وہ انہی کا خاصہ ہے۔ بعدازاں دورانِ سفر بھی، جس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا، انتظامی امور میں ان کی مہارت سے ہم سب خوب مستفید ہوئے۔

انڈین نیشنل تھیٹر کی جانب سے دعوت نامہ بھجوانے سے قبل ناموں کے ہجوں کی تصدیق کے سلسلے میں پہلی ای میل جولائی کے تیسرے ہفتے میں ملی اور مدعوئین کی حتمی فہرست مکمل ہوتے ہوئے دواڑھائی ہفتے لگ گئے۔ پہلا دعوت نامہ بارہ اگست کو ملا جس میں لاہور سے تینتیس لوگوں کو انڈین نیشنل تھیٹر چندی گڑھ کے زیرِ انتظام بھارتیہ ودیا بھون میں ۲۴ تا ۲۶ اکتوبر منعقد ہونے والے سینتیسویں سنگیت سمیلن کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر یہ کیا؟

سبھی کو بھولے ہوئے کام یاد آنے لگے

ہمارے ساتھ کوئی دو قدم چلا بھی نہیں

ایک ایک کر کے عدم دستیابی ظاہر کرنے کا سلسلہ ہوا؛ کوئی ان دنوں ملک سے باہر ہے تو کوئی ذاتی مصروفیت کی وجہ سے نہیں جا سکتا، کسی کی طبیعت خراب ہے تو کوئی فی الحال اپنا پروگرام بتانے سے قاصر ہے، کسی کے پاس ویزا موجود ہے تو کوئی ذاتی طور پر چندی گڑھ آن ملے گا۔

رج دیاں پیڑاں

ہر دوسرے دن اس نوعیت کی ای میلز پڑھ کر میں دعوت نامے پر نظر ڈالتا۔ مدعوئین میں سے بیشتر لوگ یا تو اس سے پہلے کئی بار ہندوستان جا چکے تھے یا اپنی سماجی، کاروباری اور نسبی ''سہولت'' کے باعث اُن کے لیے وہاں جانا ایسا مشکل نہ تھا۔ میں سوچتا رہا کہ ان کی اس نوعیت کی ای میلز کی وجہ ''سیر شکمی'' کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے؟ ادھر اپنی خوشی کا عالم دیدنی تھا کہ پہلی بار ہندوستان جانے کا اتفاق ہو رہا ہے اور وہ بھی واہگہ کے راستے سرحد عبور کر کے! اس سفر میں دہلی، آگرہ، جے پور، کلکتہ، ممبئی، لکھنؤ، بنارس، جودھ پور، احمد آباد، مدراس یا اجمیر وغیرہ نہ سہی، اٹاری سے چندی گڑھ تک بذریعہ سڑک سفر کے دوران کم از کم پنجاب کا کچھ حصہ تو دیکھنے کو ملے گا اور اس کے علاوہ چندی گڑھ کے نو دریافت دوستوں کی پر خلوص صحبت میں عمدہ موسیقی بھی سن سکوں گا۔

......دو چار رہ گئے

انڈین نیشنل تھیٹر کی طرف سے موصول ہونے والا پہلا دعوت نامہ تینتیس لوگوں کے نام تھا لیکن مذکورۂ بالا وجوہات کے باعث کم ہوتے ہوتے یہ تعداد دس تک آ گئی:

بالآخر تیرہ ستمبر کو انڈین نیشنل تھیٹر کی طرف سے حتمی طور پر ملنے والے دعوت نامے میں ارم توقیر، سعدیہ طارق، ماہ طلعت، سلمیٰ عبدالرحمٰن، فرازے سید، فرخ محبوب خان، نسا خان، غزالہ عرفان، اور زہرا عارفہ سیدہ کے ساتھ میرا نام بھی شامل تھا۔

''بس تجھے رہنما کرے کوئی''

حتمی دعوت نامہ موصول ہونے کے بعد سعدیہ کی ای میل آئی کہ آن لائن ویزا فارم پر کر کے اس کا پرنٹ مطلوبہ کاغذات کے ہمراہ پندرہ ستمبر تک سنجن نگر پہنچا دیں تا کہ سارے فارم ایک ساتھ بھارتی ہائی کمیشن اسلام آباد کو بھجوائے جا سکیں۔ اس نیک کام

میں تاخیر چہ معنی؟ حسب الحکم تعمیل کر دی گئی۔ اس دوران کھوسلا صاحب کی طرف سے سفری رہنمائی کے موضوع پر ای میلز موصول ہوتی رہیں جن میں مذکور ہدایات کے پسِ پردہ واحد نکتہ یہ تھا کہ دورانِ سفر ہمیں کم سے کم دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تمام تحریروں کے بین السطور ہمیں اپنے میزبانوں کے اشتیاق کا بخوبی اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

کھوسلا صاحب کی تجویز تھی کہ ہم امرتسر، پنچکلا اور چندی گڑھ کے لیے تو ضرور ویزا اپلائی کریں جہاں بالترتیب گزرنا، رہنا اور سنگیت سمیلن میں شرکت کرنا ہے لیکن ساتھ ہی ہماچل پردیش کے لیے بھی درخواست کر دی جائے جو پنچکلا سے زیادہ دور نہیں اور وہاں مغل دور کا ''پنجور گارڈن'' دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ ایک دن کے لیے دہلی کا چکر لگانا چاہیں وہ اس کا ذکر بھی کر دیں۔ چندی گڑھ سے دہلی کے لیے دن میں چار ٹرینیں جاتی ہیں اور یکطرفہ راستہ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کا ہے۔ تجویز اچھی تھی، دل کو لگی اور ہم نے ایسا ہی کیا مگر جب اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں پاسپورٹ واپس ملے تو صرف امرتسر، پنچکلا اور چندی گڑھ کا ویزا ہی دیا گیا تھا:

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

◆◆◆

......بیرون شدز منزل

پروگرام یہی طے پایا تھا کہ ۲۳ اکتوبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے سب لوگ سنجن نگر میں اکٹھے ہوں گے۔ میں صحیح اندازہ رکھ کر اپنے گھر واقع کیولری گراؤنڈ سے چلا لیکن ٹریفک کے رش کی وجہ سے وقت زیادہ لگ گیا۔ آٹھ بج کر چالیس منٹ کے قریب گلبرگ مین بلیوارڈ پر تھا کہ سعدیہ کی کال آ گئی۔ میں نے جواباً کہا کہ ہوم اکنامکس کالج کے قریب ہوں اور زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں سنجن نگر پہنچ جاؤں گا۔

رہ نوردانِ شوق

سنجن نگر پہنچا تو رشیدہ، ارم اور قاسم جعفری بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سعدیہ آئیں اور بتایا کہ ڈاکٹر غزالہ عرفان بھی پہنچنے والی ہیں۔ ساتھ ہی یہ خبر سنائی کہ میڈم سونو (شائستہ سراج الدین) طبیعت کی خرابی کے باعث ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں۔ گویا یہ مختصر قافلہ صرف چھے افراد پر مشتمل ہوگا۔ بیلا اور طارق جمیل ہندوستان میں ہی ہیں اور چندی گڑھ میں ہمیں جوائن کر لیں گے۔

قاسم جعفری کو اپنے ہمراہ پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اُن کی پُر لطف صحبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے جنھیں خوش قسمتی سے اُنھیں ملنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ تہذیب و ثقافت، فن و ادب اور جمالیات کا خمیر خاندانی نجابت، وضع داری اور حسنِ اخلاق کے عرق میں گندھے تو ایسی دل پذیر شخصیت وجود میں آتی ہے۔ مجھے دیکھ کر حسبِ معمول

بڑے تپاک سے ملے اور میرے یہ مصرع پڑھنے پر کہ ''آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک''، اِس کے برمحل ہونے کی خوب داد دی۔

ڈاکٹر غزالہ بھی میری طرح ٹریفک میں پھنس کر لیٹ ہوگئی تھیں۔ اُن کے آتے ہی سامان گاڑیوں میں رکھوایا گیا اور تقریباً ساڑھے نو بجے ہم سنجن نگر سے واہگہ کے لیے روانہ ہوئے۔ قاسم جعفری کی گاڑی میں اُن کے علاوہ ڈاکٹر غزالہ اور میں جب کہ سعدیہ، ارم اور رشیدہ سنجن نگر کی بڑی جیپ میں بیٹھ گئیں۔

کابل براستہ واہگہ ؟

نہر کے بعد جلو کا علاقہ ختم ہوتے ہی سرحدی دیہاتی علاقے کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوگئے۔ مجھے کافی عرصہ قبل پرچم اتارنے کی تقریب میں شرکت کے لیے یہاں آنے کا اتفاق ہو چکا تھا لیکن تب تک لاہور نے سڑکوں اور پلوں کے نام پر جدت کا لبادہ نہیں اوڑھا تھا۔ اب تو یہ منظر میری توقعات سے کہیں زیادہ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ واہگہ بارڈر سے ذرا پہلے ٹریفک پولیس کے ناکے سے گزرے تو گاڑیوں میں جھانک کر بظاہر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کا جائزہ لیا گیا۔ میں نے بطور انتظامی افسر اپنے تجربے سے پہچان لیا کہ ٹریفک پولیس کے بہروپ میں یہ کسی اور محکمے کے ملازم ہیں۔

به هر رنگی که خواهی جامه می پوش
من انداز قدت را می شناسم

میں نے زیرِلب شعر پڑھا تو قاسم نے اچک لیا۔ اُن کے ''می شناسم'' کی تکرار نے خاصا لطف دیا۔ ہماری گاڑی آگے اور سنجن نگر والی پیچھے تھی۔ مزید آگے بڑھے تو رینجرز کی چیک پوسٹ پر روک لیا گیا۔ ایک چھ فٹا رینجر اہلکار دونوں گاڑیوں کو بغور دیکھتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ ہمارے ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ ہٹایا تو ساتھ ہی اپنی

گردن دروازے کے قریب لاکر بولا: ''انڈیا جارہے ہیں؟'' ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ ہاں، پچھلی گاڑی بھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔'' ''اوکے، اوکے...... جائیں''، رینجرز اہلکار بولا اور ہمارے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سر پیچھے ہٹا لیا۔ قاسم کی رگِ ظرافت پھڑکی اور بولے: ''اور اس راستے سے کابل جاتے ہیں کیا؟'' لیکن ہمارا ڈرائیور ''جائیں'' کی آواز سن کر رینجرز اہلکار کا چہرہ کھڑکی سے دور ہوتے ہی شیشہ چڑھا چکا تھا۔

کیا مال منال کا پوچھتے ہو

دو تین منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم واہگہ کسٹم کی چوکی پر پہنچ گئے۔ گاڑیوں سے سامان اتار کر ٹرالیوں میں رکھتے ہوئے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ پرانے خستہ حال کمروں کے بجائے جدید طرز کی عمدہ عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ سامان لے کر اندر داخل ہوئے تو ایک صاف ستھرے ہال میں متعدد کاؤنٹر بنے تھے جن میں سے تین پر سرحد پار کر کے بھارت جانے والے مسافروں کی سفری دستاویزات جانچ کر ایگزٹ کی مہریں لگائی جارہی تھیں۔

امیگریشن سے پہلے کسٹم کے کاؤنٹر پر حاضری دینا بھی لازم تھا کہ ہمراہ لے جانے والے سامان کی چیکنگ کروائی جا سکے۔ وہاں گئے تو متعلقہ اہلکاروں نے بھی سامان سے زیادہ چہروں اور چال ڈھال کا جائزہ لیا اور غالباً اسی سے جانچ لیا کہ اِن مسافروں کے سامان میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک دو بیگ کھول کر اپنے اندازے کو اطمینان میں بدل چکے تو ہمیں امیگریشن کاؤنٹرز کی طرف جانے کا اشارہ کر دیا۔

اتنی دیر میں کچھ اور مسافر بھی لاؤنج میں داخل ہو کر انہی مراحل سے گزرتے ہوئے امیگریشن کاؤنٹر کے سامنے قطار میں کھڑے ہو چکے تھے۔ خواتین اور مردوں کے

کاؤنٹرز الگ الگ تھے۔ قاسم اور میں بھی ایک قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ ساتھ والی قطار خواتین کی تھی جس میں اکثر برقع پوش اور دیگر تمام باپردہ خواتین تھیں۔ اُن کے ہمراہ زیادہ تر مرد بھی باریش تھے اور آپس میں جنوبی ہند کی کسی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو، ظاہر ہے، میں سمجھ نہ سکا۔ تاہم امیگریشن آفیسر سے ہونے والی اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ کم از کم دو یا تین درجن افراد پر مشتمل یہ گروہ، جس میں فیملیز بھی شامل تھیں، کسی صوفی سلسلے کا پیروکار تھا اور خانقاہ کی زیارت اور عرس وغیرہ کی تقریبات کے لیے پاکستان آیا تھا۔ یہ تمام لوگ جن میں ہر عمر کی خواتین، مرد اور بچے شامل تھے، کسی بھی طرح مالی طور پر آسودہ حال دکھائی نہیں دے رہے تھے تاہم اُن کے چہروں پر موجود اطمینان کی جھلک اس بات کی شاہد تھی کہ وہ اپنی روحانی وابستگی کے باعث یہ مالی اور جسمانی تکلیف اٹھا کر بھی خوش ہیں۔ ادبیات کا طالب علم ہونے کے باعث مجھے برِ صغیر کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں یاد آنے لگیں جب روحانی جذبے سفر کی صعوبتوں پر غالب آ گئے۔ مرید، مرشد اور خانقاہ کا تعلق ہی ایسا ہے کہ جذبۂ شوق خود ہی تمام مراحل آسان کر دیتا ہے۔

سفری دستاویزات میں اہم ترین چیز پولیو بچاؤ قطرے پی چکنے کا سرٹیفکیٹ تھا جس کی تاکید ویزا دیتے وقت بھارتی ہائی کمیشن نے بھی کی تھی۔ محکمانہ عدم اعتراض اور دیگر کاغذات دیکھ کر امیگریشن آفیسر نے ہمارے پاسپورٹ پر ایگزٹ کی مہر لگائی اور ہم سامان کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے عمارت سے باہر آ گئے۔ ''بابِ آزادی'' سامنے تھا جس سے گزر کر ہمیں بھارت میں داخل ہونا تھا۔

◆◆◆

سامان پھڑ جسّے !

بیرونِ ملک سفر کا وسیلہ ہوائی جہاز ہو یا زمینی، کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے پر اجنبیت کا سب سے پہلا احساس وہاں کی زبان سے ہوتا ہے۔ ہوائی اڈے پر اتریں یا سرحد پار کریں، چیزوں کے نام ہی بدل جاتے ہیں۔ کانوں میں پڑنے والی آوازیں اجنبی سنائی دینے لگتی ہیں اور یقین آ جاتا ہے کہ ہم اپنے وطن کے بجائے کسی دوسری سرزمین پر پہنچ چکے ہیں۔

پاکستان کے ہمسایہ ممالک ایران، افغانستان اور چین میں بالکل یہی احساس ہوتا ہے لیکن یہاں ہندوستان میں صورتِ حال مختلف تھی۔ ہم نے ٹرالیوں سے سامان اتار کر سرحدی لکیر کے اُس پار رکھا تو وہاں موجود رینجرز اہلکاروں نے ایک بار پھر اپنی فائلوں میں موجود فہرستوں سے ہمارے پاسپورٹ اور اُن پر لگی ایگزٹ کی مہروں کی تصدیق کی۔ اِس مرحلے سے گزر کر ہم نے پہلے خود لکیر پار کی اور پھر اپنے سامان کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ہندوستانی قلی ٹرالیوں سمیت کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ کسی نے ''سامان پھڑ جسّے !'' کی آواز لگائی اور تین چار قلی لپک کر ہمارا سامان ٹرالیوں پر رکھنے لگے۔ دفعتاً مجھے اپنے پچھلے بیرونِ ملک اسفار میں اس موقع پر پیش آنے والی صورتِ حال یاد آئی۔ ایران میں تو فارسی جاننے کے باعث مشکل نہیں ہوئی، کسی اور ملک گئے تو انگریزی سے کام چلا لیا لیکن یہاں تو الفاظ، زبان، لہجہ کچھ بھی اجنبی نہیں۔ ایک لفظ

''جیسے'' کی تبدیلی سے کم وبیش اسی لہجے میں یہ جملہ میں کئی بار اپنے ریلوے سٹیشنوں اور بس اڈوں پر سن چکا ہوں:

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

امیگریشن و کسٹم دوراست

سرحد پار کرتے ہوئے رشیدہ نے بتلایا کہ یہاں بھی پہلے بارڈر سیکورٹی فورس والے اپنی فہرستوں کے مطابق ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کریں گے اور پھر بس پر بیٹھ کر امیگریشن اور کسٹم کے دفاتر جانا ہوگا جو کہ واہگہ کی نسبت سرحد سے ذرا فاصلے پر واقع ہیں۔ اس مختصر سے قافلے میں بھارت یاترا کے حوالے سے سب سے زیادہ تجربہ کار رشیدہ ہی تھیں۔ اُن کے بعد قاسم جعفری اور پھر ڈاکٹر غزالہ عرفان۔ ارم بھی چند برس قبل ایک بار دہلی آ چکی ہیں۔ سعدیہ کا اور میرا یہ پہلا سفر تھا۔

سامان بسوں میں رکھا جا چکا تو ہم بھی سوار ہوئے۔ ہمارے بعد سرحد پار کرنے والے کچھ دیگر مسافر بھی آ رہے تھے لہٰذا اُن کے بیٹھ چکنے پر بس امیگریشن آفس کی طرف روانہ ہوگئی۔ پانچ منٹ میں ہم پاکستانی کسٹم لاؤنج سے کہیں بڑی عمارت کے سامنے بس سے اتر رہے تھے۔ راستے میں سڑک کے ایک جانب سبزیوں سے لدے درجنوں ٹرکوں پر نظر پڑی جو کسٹم کارروائی کے انتظار میں سرحد کے اس جانب کھڑے تھے۔

سامان لے کر پہلے امیگریشن کے کاؤنٹر پر پہنچے جہاں ایک دو فارم پُر کرنے کو دیے گئے۔ یہاں بھی رشیدہ کی رہنمائی کام آئی۔ اس دوران سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان سردار جی اپنے ساتھی اہلکار کے ہمراہ گفتگو کے بہانے زبانی معلومات جمع

کرنے ایک دوبار ہمارے پاس آئے۔ سفری دستاویزات میں جس کاغذ کو اہم ترین سمجھ کر طلب کیا اور پرکھا گیا وہ پولیو بچاؤ قطرے پینے کا سرٹیفکیٹ تھا! میں نے ازراہِ تفنن امیگریشن آفیسر سے اِس کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ اس کا بطورِ خاص اندراج کیا جانا ضروری ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ہندوستان تو ۲۰۱۲ء سے ''پولیو فری'' ملک قرار پا چکا ہے لیکن ہمارے ہاں ابھی تک پولیو ویکسین میں شامل ''دیگر'' اجزا اور اِن کے پینے کے شرعی جواز اور عدم جواز پر بحثیں جاری ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں پولیو کیسز کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ جنوبی پنجاب کے دو ضلعوں میں ہیلتھ سیکٹر ریفارم پروگرام کے ضلعی منیجر کے طور پر خدمات انجام دے چکنے کے باعث میں ذاتی طور پر اُن مسائل سے بخوبی آگاہ ہوں اور چھوٹی موٹی سرکاری حیثیت میں اِن سے نبرد آزما رہ چکا ہوں۔

حسبِ سابق قاسم اور میں کسٹم کے مراحل سے بہت جلد فارغ ہو گئے۔ دراصل امیگریشن کے بعد کسٹم کے کاؤنٹر پر پہنچے تو ایک اہلکار نے قاسم جعفری کو دیکھ کر اشارے سے سلام کیا اور اُن کے ساتھ ساتھ میرا سامان بھی لے کر کمال مستعدی سے کسٹم والوں کو چیک کروانے لگا۔ قاسم نے بتایا کہ وہ عموماً سال میں تین چار مرتبہ اس راستے سے ہندوستان آتے ہیں لہٰذا یہ اہلکار انھیں پہچانتا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ بے چارہ سماعت اور گویائی کی نعمتوں سے محروم ہے۔

چاروں خواتین کو کسٹم کے مراحل سے عہدہ برآ ہوتے خاصا وقت لگ گیا جب کہ قاسم اور میں فراغت پا کر انتظار گاہ میں آ بیٹھے۔ یہاں بھی ایک ڈیسک پر سادہ لباس والے نوجوان افسر موجود تھے جو زبانی معلومات کی خاطر ایک دوبار گفتگو کی زحمت اٹھا چکے تھے۔ میں باتھ روم سے واپس آیا تو قاسم نے مشورہ دیا کہ اگر کرنسی تبدیل کروانا ہو تو سامنے بوتھ سے کروا لوں کیونکہ اس کے بعد چندی گڑھ تک ہم راستے میں نہیں رکیں گے، نیز کل اور پرسوں دیوالی کی چھٹی کے باعث وہاں کے بینک اور منی چینجر وغیرہ بند

ہوں گے لہٰذا دشواری ہوسکتی ہے۔ میں نے حسبِ ضرورت کچھ امریکی ڈالر ہندوستانی روپوں میں بدلوا لیے۔

للت شرما

بھارتی کسٹم لاؤنج خاصا وسیع ہے۔ایک کونے میں کاؤنٹرز ہیں جہاں ہماری ہم سفر خواتین اپنا سامان چیک کروا رہی تھیں جب کہ دوسری جانب دفاتر ہیں۔دوسرے کونے پر منی چینجر بوتھ اور درمیان میں انتظار کرنے والے مسافروں کے لیے آرام دہ کرسیاں لگی ہیں۔سامنے کی جانب بیرونی راستہ ہے۔

میں کرنسی بدلوا کر مڑا تو گہرے سرخ رنگ کی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس ایک صاحب آگے بڑھے اور اپنا نام للت شرما بتاتے ہوئے مجھے نمسکار کہا۔قاسم بھی بیرونی دروازے کے قریب کھڑے تھے۔للت اور میں چلتے ہوئے اُن کے پاس آ گئے۔للت نے بتایا کہ وہ ایک ٹریول کمپنی چلاتے ہیں اور ہمیں چندی گڑھ تک پہنچانے کے لیے گاڑی اُنہی کی کمپنی سے لی گئی ہے۔

دیوالی کا ناشتہ

رشیدہ، ارم، سعدیہ اور ڈاکٹر غزالہ کسٹم کلیرنس سے فارغ ہو کر آئیں تو ہم سب ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے لاؤنج سے باہر آئے۔للت شرما ہماری رہنمائی کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر کھڑی ایک منی کوسٹر کی طرف بڑھنے لگے۔ابھی ہم کوسٹر کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ اُس میں سے ڈرائیور اور ایک چھوٹی سی بچی باہر نکلے۔للت کا اشارہ پا کر ڈرائیور سامان رکھنے لگا۔للت بولے یہ میری بیٹی ہے جو گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے آپ کو دیوالی کے تحائف پیش کرنا چاہتی ہے۔اس بچی نے دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے سے شاپنگ بیگ میں سے ہم سب کو چھوٹے چھوٹے گفٹ پیک، ایک ایک فروٹ

باسکٹ جس میں دو چار موسمی پھل خوبصورت ترتیب سے رکھے تھے اور منرل واٹر کی ایک ایک بوتل پیش کی۔ جواباً ہم سب نے بچی کو پیار کیا اور دعا دی۔ اتنے میں ڈرائیور ہمارا سامان میں رکھ چکا تھا۔ ہم سب بھی سوار ہو چکے تو فرنٹ گیٹ سے للت گاڑی میں داخل ہوئے اور ڈرائیور کی پچھلی نشست پر پڑے سٹیل کے بڑے سے ڈول سے لسی نکال کر ڈسپوزایبل گلاسوں میں ڈال کر ہمیں پیش کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ دو بڑے ہاٹ پاٹ بھی ارم کو تھمائے جو میرے متوازی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ ہم نے اس غیر متوقع تکلف پر حیرت اور تشکر کا اظہار کیا تو ہاٹ پاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ اِس میں میری بیوی کے بنائے ہوئے پراٹھے ہیں۔ یہ لسی اور ڈسپوزایبل پلیٹوں میں پیک دہی بھی میری اپنی بھینسوں کے دودھ کا ہے۔ کوئی شے بھی بازار کی نہیں۔ ہم نے اس سارے سامان کی مقدار بہت زیادہ ہونے کا کہا تو کہنے لگے کہ مجھے تو دس بارہ آدمیوں کے آنے کی اطلاع تھی لہٰذا میں یہ سامان اُسی اندازے سے لایا ہوں۔

ڈرائیور نے گاڑی چلا دی اور للت اُسے ہمارا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے موٹر سائیکل سٹینڈ کے قریب اتر گئے۔

کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں

امیگریشن آفس سے نکل کر مرکزی سڑک پر آتے ہی گاڑی نے سپیڈ پکڑنے کی کوشش کی تو پہیوں میں سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ ڈرائیور نے بریک لگائی تو آوازیں مزید خوفناک ہو گئیں اور گاڑی ڈولنے لگی۔ ایک دو مرتبہ ایسا ہوا تو ڈرائیور نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر اس کا سبب جاننے کی کوشش کی اور یہ کہتا ہوا واپس آ بیٹھا کہ کل سروس کرواتے ہوئے کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ شاید باقی سفر اسی مسئلے کے ساتھ طے کرنا پڑے۔ بس ذرا رفتار ہلکی رکھنا ہو گی۔

جونہی گاڑی دوبارہ سڑک پر آئی تو آوازوں اور لڑکھڑاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ سعدیہ نے للت کو فون ملایا اور گاڑی بدلنے کا کہا۔ للت نے ڈرائیور سے بات کی اور کاروباریوں کے روایتی انداز میں تسلی دینے لگا کہ چنتا مت کیجیے، آپ ذرا دیر سے سہی لیکن بحفاظت چندی گڑھ پہنچ جائیں گے۔ لیکن گاڑی میں بیٹھے ہم لوگ سمجھ چکے تھے کہ چندی گڑھ تک پہنچانا اس گاڑی کے بس کی بات نہیں۔ سعدیہ نے سختی سے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ اس پر ڈرائیور نے ایک بار پھر للت سے بات کی اور مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر گاڑی ایک ذیلی سڑک پر ڈال دی۔

تھوڑی ہی دیر میں امرتسر ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے گاڑی روکی گئی بلکہ خود ہی رک گئی اور للت کا صبر آزما انتظار شروع ہوا۔ آدھ گھنٹے تک وہ فون پر یہی تسلی دیتے رہے کہ دوسری گاڑی تو موجود ہے لیکن دیوالی کی چھٹی کے کارن کوئی ڈرائیور نہیں مل رہا۔ سعدیہ اور رشیدہ کا غصے سے برا حال تھا۔ سب کو بھوک بھی لگ رہی تھی اور مجھے چائے کی شدید طلب تھی۔

للت کو موقع پر بلوا کر گاڑی بدلوانے کے اس سارے عمل میں فائدہ یہ ہوا کہ بائی پاس کے بجائے ہمیں امرتسر شہر کے اندر سے گزرنا پڑا۔ قریبی چوک پر لگے رہنمائی کے نشانات سے اندازہ ہوا کہ ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے جہاں ہم خراب گاڑی کے ساتھ کھڑے تھے، ریلوے سٹیشن کے قریب کوئی جگہ تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اردگرد کے منظر میں زیادہ اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ وہی پیپسی اور کوک کے اشتہاری بورڈ، سستے مقامی فاسٹ فوڈ کے کھوکھے اور دکانیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم لاہور کے کسی متوسط طبقے کے علاقے میں کھڑے ہوں۔ مانوسیت کی یہ لہر ذہن میں اُس وقت بھی آتی رہی تھی جب امرتسر شہر میں داخل ہونے پر مانانوالہ اور جنڈیالہ سمیت مغربی پنجاب کے مزید کتنے ہی قصبوں کے ناموں والے دکانوں کے بورڈز پر نظر پڑی۔

شہر میں داخل ہونے سے ذرا پہلے چلتی بلکہ لڑکھڑاتی گاڑی میں بیٹھے قاسم نے

بتایا کہ ابھی ہمارے بائیں طرف خالصہ کالج آئے گا۔عمارت کی تعریف بھی کی۔ میں نے موبائل فون پر سفری نوٹ لینے بند کیے اور اشتیاق سے اپنے بائیں طرف دیکھنے لگا۔ واقعی کسی کالج کی ایسی شاندار عمارت میں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔گاڑی کافی دیر تک اس عمارت کے ساتھ ساتھ چلتی رہی جس سے اس کی وسعت کا بھی اندازہ ہوا۔ پرانی عمارت ختم ہوئی تو ساتھ ہی گرلز کالج کی سفید عمارت تھی۔ نئے انداز کی بنی ہوئی یہ عمارت بوائز کالج کی میرون پرانی عمارت کے ساتھ کھڑی ذرا بھی نہیں جچ رہی تھی۔قاسم اور میں کافی دیر تک اس پر بات کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو میری مشتاق اور متجسس نظروں کو اِدھر اُدھر گھومتا دیکھ کر قاسم بٹالہ، گورداسپور اور بیاس کی طرف جانے والی سڑکوں کی نشان دِہی کرتے رہے۔ بیاس کے پُل سے گزرتے ہوئے پانچ دریاؤں کا ذکر ہوا جو ہمارے یہاں تین یا ساڑھے تین ہی رہ چکے ہیں۔ میں نے قاسم کی خوش قسمتی پر رشک کا اظہار کیا کہ وہ سال میں دو تین بار ہندوستان ہو آتے ہیں۔

دگر از سر گرفتم ......

خدا خدا کر کے موٹر سائیکل پر سوار للت شرما ایک دوسری کوسٹر وین کے ہمراہ آن پہنچے اور وہی معذرت کرنے لگے کہ ڈرائیور کو اُس کے گھر سے جا کر لانا پڑا اِس لیے دیر ہوگئی۔ اب اس نئی گاڑی اور ڈرائیور سے آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ سامان دوسری گاڑی میں منتقل کیا گیا اور ہم سب للت کی معذرت قبول کرتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوئے۔

نئی گاڑی کا ڈرائیور بھی پہلے والے کی نسبت ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی ایک پٹرول پمپ سے ٹینکی فل کروائی اور اس دوران کپڑے بدل کر ڈرائیور یونیفارم پہنے اپنی سیٹ پر آن بیٹھا۔ مین روڈ پر آ کر گاڑی کی سپیڈ بہتر ہوئی اور اے سی کی ٹھنڈک بھی بڑھی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔

امرتسر میں دعوتِ شیراز

گھڑی پر نظر ڈالی تو دو بج رہے تھے۔ تھکن اور بھوک سب کے چہروں سے عیاں تھی۔ ارم بولیں: ''دیکھیں تو سہی للت کیا ناشتہ لائے تھے۔'' قاسم کہنے لگے: ''اب تو اس ناشتے کو لنچ ہی سمجھ کر تھوڑا بہت کھالیں۔'' چنانچہ ایک ایک کر کے شاپر بیگ اور ہاٹ پاٹ کھولے گئے تو بڑے سلیقے سے ایلومینم فوائل میں لپٹے درجنوں پراٹھے، ڈسپوزایبل پلیٹیں، چمچ، گلاس اور پلاسٹک کی چھوٹی رکابیوں میں دہی موجود تھا۔ دیسی کھانے کی ملی جلی خوشبو سے گاڑی مہک اٹھی۔ ارم پلیٹوں میں پراٹھے رکھ کر دہی کی رکابی کے ہمراہ سب کو دیتی گئیں۔ ساتھ ہی باقی ماندہ لسی کا دور بھی چلا۔ پراٹھے واقعی بے حد لذیذ تھے۔ ہمارے یہاں عموماً آلو، قیمے یا مولی وغیرہ کے پراٹھے بنتے ہیں لیکن یہ کوئی نئی ترکیب معلوم ہوتی تھی جس میں پالک اور گوبھی کا ذائقہ بھی محسوس ہو رہا تھا اور ساتھ ہی پنیر کی آمیزش بھی اپنا پتہ دے رہی تھی۔ ویسے تو اس بھوک میں جو بھی مل جاتا غنیمت تھا لیکن ان پراٹھوں اور دہی کی لذت نے للت شرما کا قصور کافی حد تک معاف کرا دیا۔

کھانے کے دوران ہم سب سڑک کے دونوں طرف کے مناظر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ امرتسر اب کافی دور رہ گیا تھا اور ہم کہیں جالندھر کے نواح میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ مرکزی شاہراہ پر آنے والے چھوٹے قصبوں کے نزدیک زرعی آلات کی دکانوں اور ٹریکٹروں کی ورکشاپوں کے ساتھ ساتھ نظر آنے والی نمایاں ترین چیز ''ڈھابے'' تھے جن پر انگریزی اور ہندی میں واضح طور پر veg اور non-veg لکھا ہوا تھا۔

امرتسر کے نواح سے گزرتے ہوئے کئی جگہ سڑک کے کنارے ڈور لگتی دکھائی دی۔ ہمارے یہاں پتنگ بازی پر بوجوہ پابندی لگنے سے پیشتر ڈور لگانے کا کاروبار خاصا زیادہ تھا اور اکثر علاقوں میں درختوں کے تنوں میں سوراخ کر کے انھیں زمین میں

گاڑ کر ڈور لگانے کا اڈہ بنالیا جاتا تھا لیکن اب نہیں۔ امرتسر میں یہ اڈہ اور ڈور لگتی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ثقافت کا یہ مظہر کم از کم یہاں تو زندہ ہے۔

حویلی

امرتسر سے باہر نکلتے ہی سڑک کے دونوں جانب تھوڑے فاصلے پر ''حویلی'' نام کے ہوٹل نظر آنے لگے تھے۔ کہیں کہیں ساتھ میں شادی ہال بھی تھا۔ قاسم نے بتایا کہ ''حویلی'' دراصل ہوٹلز کی ایک بڑی چین ہے جو پنجاب بھر میں اس نام سے سیکڑوں ہوٹل چلاتی ہے۔ پراٹھوں اور لسی سے بھوک مٹانے کے بعد چائے کی طلب مزید بڑھ چکی تھی چنانچہ طے پایا کہ جالندھر بائی پاس کے نزدیک ''حویلی'' سے چائے پی جائے۔

''حویلی'' کے نام سے چلنے والے اِن ریستورانوں کا بنیادی آئیڈیا ہمارے ہاں کے ''ولیج'' والا ہے۔ کچھ عرصہ قبل لاہور سے شروع ہونے والے اس ریسٹورنٹ کے بعد ''ویہڑہ'' اور ''ڈیرہ'' بھی اسی طرز پر بنائے گئے اور دیہی ماحول میں لذیذ کھانوں کی وسیع ورائٹی پیش کرنے کے باعث خاصے مقبول ہو چکے ہیں۔ جالندھر بائی پاس پر واقع ''حویلی'' بھی ایسا ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ مرکزی ہال سے پہلے وسیع برآمدہ جس کے درمیان میں رہٹ کا ماڈل بنایا گیا تھا اور اطراف میں مختلف کھانے اور مشروبات تیار کیے جا رہے تھے۔ میزوں کرسیوں کے ساتھ ساتھ چارپائیاں اور لکڑی کے ایک دو تخت بھی بچھے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہال کے اندر انتظام اِس سے بہتر تھا اور بیٹھنے کی گنجائش بھی زیادہ تھی۔

دیوالی کا دن ہونے کے باعث بہت سی فیملیز دوپہر کا کھانا کھانے آئی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے سے دیوالی کی شبھ کامناؤں اور تحائف کا تبادلہ جاری تھا اور کچھ ٹین ایجر نوجوان بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی عمر کے تقاضے نبھا رہے تھے۔

واش روم سے فراغت کے بعد سب نے چائے کے کپ لے کر ریسٹورنٹ کا چکر لگایا۔ ڈاکٹر غزالہ نے البتہ کافی پی۔ چلتے چلتے میں نے اپنے موبائل فون میں قاسم جعفری کے ساتھ اس سفر کی پہلی تصویر بنوائی اور ہم چندی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

ہندوستان رقبے اور آبادی کے لحاظ سے خاصا بڑا ملک ہے لہٰذا سڑک کے کنارے جگہ جگہ بنے چھوٹے موٹے ہوٹلوں، ڈھابوں اور ٹریول ریزارٹس سے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ یہاں سیر و تفریح اور تجارت کے لیے عمومی طور پر سفر بھی زیادہ کیا جاتا ہے۔

چلتی گاڑی سے نظر آنے والے مناظر میں سب سے زیادہ اچنبھا مجھے گھروں کی چھتوں پر سیمنٹ سے بنے مختلف ماڈلز دیکھ کر ہوا۔ فٹ بال، عقاب، بیلوں کی جوڑی اور دیگر کئی انداز کے بنے ہوئے ماڈل دیکھ کر میں بڑی دیر تک اِن کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہم سفروں سے گفتگو کے دوران اِس کا ذکر آیا تو قاسم نے وضاحت کی کہ یہ دراصل گھروں کی چھتوں پر بنی پانی کی ٹینکیاں ہیں۔ اِتنے مختلف ڈیزائن دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پلاسٹک یا سیمنٹ کی سادہ ٹینکی بہت ہی کم نظر آئی۔ ارم کہنے لگیں کہ اس علاقے کے لوگ بڑے باذوق معلوم ہوتے ہیں۔ قاسم مسکرا دیے۔ میں نے سوچا:

ہر جا کہ ہست ذوقی می گردد آشکارا

وہی نقشہ ہے و لے اس قدر آباد نہیں

جالندھر سے چندی گڑھ تک کتنے ہی چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات سے گزر ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ گاہے گاہے سکوٹر اور موٹر سائیکل چلاتی ہوئی خواتین، رنگین

پگڑیاں باندھے ہوئے سکھ سردار اور کبھی کبھار نظر آ جانے والی وائن شاپس چھوڑ کر مجھے یہ علاقہ اپنے فیصل آباد کے نواح سے ملتا جلتا لگا۔ میں نے سوچا شاید یہ بھی ہمارے فیصل آباد اور سرگودھا کی طرح کالونی ڈسٹرکٹ ہو۔

''نواں شہر'' سے گزرتے ہوئے عملے اور پھاٹک کے بغیر ریلوے کراسنگ کو عبور کیا تو مجھے اپنے یہاں کی بے شمار ایسی سڑکیں اور پھاٹک یاد آ گئے جو برسوں سے ریلوے کی بے نیازی کا شکار ہیں اور اِس دوران کئی مہلک حادثات کا سبب بھی بن چکے ہیں۔ ایسا ہی ایک حادثہ ۱۹۹۷ء میں میری قصور تعیناتی کے دوران بھی ہوا تھا جس کے بعد اُس ریلوے کراسنگ پر پھاٹک لگوانے اور عملہ تعینات کرنے کے لیے ضلعی انتظامیہ اور ریلوے کے درمیان کئی ماہ تک چٹھی بازی ہوتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۹۸ء میں میرا تبادلہ گوجرانوالہ ہو گیا۔ تقریباً چار برس بعد بورڈ آف ریونیو کی پارکنگ میں مراد علی سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی جو قصور میں میرا ڈرائیور رہ چکا تھا۔ برسبیلِ تذکرہ میں نے اُس پھاٹک کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ابھی تک صورتِ حال جوں کی توں ہے۔

یاد نہیں آتا تو ''روپڑ''

''بہرام'' اور ''نواں شہر'' نامی قصبوں سے گزرتے ہوئے ''روپڑ...... کلومیٹر'' پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے تک جب مطالعۂ پاکستان کے بجائے تاریخ وجغرافیہ کا مضمون ہمارے سکول کے نصاب کا حصہ ہوتا تھا تو تقسیمِ ہند سے پہلے والی نسل کے لوگ متحدہ ہندوستان کے دور کا یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انسپکٹر آف سکولز نے کسی سکول کا دورہ کرتے ہوئے ایک طالب علم سے پوچھا کہ فلاں نہر کس مقام سے نکلتی ہے؟ طالب علم کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ غلط مقام کا نام لیتا، ساتھ کھڑے کلاس ٹیچر نے بروقت لقمہ دیا: ''ابے یاد نہیں آتا تو روپڑ۔'' طالب علم نے اشارہ پا کر فوراً

جواب دیا کہ وہ نہر ''روپڑ'' کے مقام سے نکلتی ہے۔

ہماری کوسٹر ریلوے روڈ روپڑ سے گزر رہی تھی۔ قاسم نے بتایا کہ اب ہم دریائے ستلج عبور کریں گے۔ ساتھ ہی ''کینال کالونی'' بھی آ گئی جسے دیکھ کر مجھے قصور، بہاول پور، وہاڑی، شیخوپورہ اور فیصل آباد سمیت کئی شہروں کی چھوٹی بڑی کینال کالونیز یاد آ گئیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ گھر کے بھاگ ڈیوڑھی ہی سے معلوم ہو جاتے ہیں، سو اِس کالونی سے گزرتے ہوئے احساس ہوا کہ عملہ اور افسران یہیں مقیم ہیں۔ ظاہر ہے دریا میں پانی ہے تو محکمۂ آبپاشی کے ملازمین کے پاس بھی کرنے کو کام ہے۔ اپنے یہاں تو دریا میں پانی ہے نہ کالونی میں عملہ، بلکہ دفتر میں بھی کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ کینال کالونی اور ملحقہ عمارات پر نظر ڈالتے ہوئے یاد آیا کہ میری تعیناتی تین ایسے اضلاع میں بھی رہی جہاں ستلج کا گزر ہوتا ہے یعنی قصور، وہاڑی، لودھراں / بہاول پور۔ ان سب جگہوں کی کینال کالونیوں اور دفاتر کے حوالے سے اپنے مشاہدات ''روپڑ'' سے موازنہ کرنے پر درست معلوم ہوئے۔

◆◆◆

کھوسلا صاحب

سجن نگر سنگیت سمیلن (مارچ ۲۰۱۴ء، لاہور) کے تذکرے میں کھوسلا صاحب کا ابتدائی تعارف تو ہو ہی چکا ہے لیکن اُن کی دلنواز شخصیت اور چنڈی گڑھ میں ہماری پرخلوص میزبانی پر تفصیلی بات ہونا ابھی باقی ہے۔

نوجیون کھوسلا کا تعلق تقسیمِ ہند کے بعد والی انڈین سول سروس کے دوسرے بیچ سے ہے۔ پٹیالہ کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے گھرانے کا نمایاں ترین وصف طویل العمری ہے چنانچہ بانوے برس کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت کے مالک ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی زبان وادب میں ایم اے کیا اور اس دوران پروفیسر پطرس بخاری، گرودت سوندھی اور دیگر نامور اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ برِصغیر پاک و ہند میں لاہور کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت کے حد درجہ قائل ہیں۔

انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (I.A.S.) کا حصہ ہونے کی بنا پر دورانِ ملازمت متعدد اضلاع کے ڈپٹی کمشنر اور بعد ازاں ڈویژنل کمشنر رہے اور بطور ممبر بورڈ آف ریونیو ریٹائر ہوئے۔ نیک نامی اور خوش ذوقی سے عبارت عرصۂ ملازمت گزارنے کے بعد آج کل چنڈی گڑھ کے قریب ایک خوبصورت علاقے ''پنچکلا'' میں مقیم ہیں۔ کلاسیکی موسیقی، سیر و سیاحت اور شکار کے علاوہ اُن کی دلچسپی مطالعہ ہے۔ اُن کے بھتیجے وشال

نے، جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا، پورچ میں کھڑی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ تایا جی نے یہ گاڑی خصوصی طور پر شکار کے لیے خریدی اور تیار کروائی تھی مگر اب گذشتہ دس بارہ برس سے شکار تقریباً ترک کر دیا ہے۔ لیکن اُن کا ڈرائیور دیس راج گاڑی کو صاف کر کے چالو حالت میں رکھتا ہے۔ ایسی شاندار، مکلّف اور آراستہ شکار گاڑی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی۔

موسیقی سے گہرے شغف کی بنا پر کھوسلا صاحب اوائل لڑکپن سے ہی ہندوستان کے طول وعرض میں ہونے والی موسیقی کانفرنسوں میں بطور سامع شرکت کر رہے ہیں۔ سول سروس میں آنے کے بعد اُنھوں نے سرکاری سطح پر بھی اس فن کی سرپرستی کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے۔ نتیجۃً ہندوستان بھر کے موسیقی کے حلقوں میں اُنھیں نہایت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے انتہائی سینئر ہونے کے سبب اُنھیں موجودہ دور کے بعض فنکاروں کے دادا یا دادی کو بھی سننے کا اتفاق ہو چکا ہے چنانچہ کلکتہ سے پنجاب اور ممبئی سے شملہ تک بیشتر فنکار انھیں پیار سے نولی انکل (Novely Uncle) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک کلاسیکی موسیقی سے محبت اور وابستگی کے ثمر کے طور پر آپ کو کئی راگوں کی ایک سے زائد بندشیں اور ٹھمریوں وغیرہ کے بول زبانی یاد ہیں۔ پنجابی، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں یکساں خوبصورتی سے گفتگو کرتے ہیں۔ طبیعت بھی ایسی شگفتہ پائی ہے کہ بلاتمیز رنگ ونسل اور زبان و مذہب ہر شخص اُن کی صحبت میں خوش رہتا ہے۔

ہفتہ ۲۵ اکتوبر کو سنگیت سمیلن کی دوسری نشست شام چھے بجے شروع ہونا تھی۔ خواتین کے شاپنگ پر چلے جانے کے بعد مجھے کھوسلا صاحب سے تفصیلی گپ شپ کا موقع ملا۔ قاسم پہلے ہی اپنے کچھ دوستوں سے ملنے موہالی جا چکے تھے۔ خواتین کے شاپنگ میں زیادہ وقت لگانے کا زندگی میں پہلی بار مجھے فائدہ ہوا کیونکہ کھوسلا صاحب

اپنے خانساماں بھگوان داس کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دینے کے بعد مکمل طور پر فارغ تھے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھوں گا کہ کسی مداخلت کے بغیر اُن سے گفتگو کرنے کا ایسا موقع ہاتھ آیا۔ ای میلز کے ذریعے ہمارا ابتدائی تعارف تو ہو ہی چکا تھا لہٰذا ہماری گفتگو باہمی دلچسپی کے موضوعات مثلاً سول سروس، گورنمنٹ کالج لاہور اور برِ صغیر کی موسیقی وغیرہ کے گرد گھومتی رہی۔ دورانِ گفتگو میں نے اُنھیں تہذیب فاؤنڈیشن (کراچی) کے روح ورواں یارِ طرحدار شریف اعوان کی عمدہ کاوش بارہ سی ڈیز کا سیٹ ''انڈس راگ'' اور رشید ملک مرحوم کے مضامینِ موسیقی پر مشتمل اپنی مرتب شدہ کتاب "Doyens of Subcontinental Music" پیش کیے۔

دورانِ گفتگو دوبار چائے پی گئی۔ میں نے سگریٹ کی اجازت چاہی تو فرمانے لگے ''بصد شوق! آیئے اسی بہانے آپ کو اپنا باغیچہ بھی دکھاتا ہوں۔''

لاؤنج کے عقبی دروازے سے باہر آئے تو پچھواڑے میں ایک مختصر مگر انتہائی سلیقے سے ترتیب دیا ہوا باغیچہ ہمارے سامنے تھا۔ فرمانے لگے: ''سرکاری ملازمت اور فنونِ لطیفہ سے وابستگی اپنی جگہ لیکن دراصل میں ایک دہقان زادہ ہوں۔ بچپن دیہات میں گزرا ہے جہاں اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کی ہے اور وہ بھی پرانے وقتوں کی جب ٹریکٹر اور دیگر مشینیں نہیں ہوتی تھیں۔ جب میں نے اس دو کنال کے پلاٹ کا نقشہ بنوایا تو پچھواڑے کے پانچ سات مرلے کھیت کے طور پر رکھ لیے۔''

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آم، جامن، پپیتا، لیموں غرضیکہ تقریباً تمام پھلوں کے ایک یا دو درخت بڑی ترتیب سے لگائے گئے تھے۔ نیچے زمین پر کھیلیوں میں لگنے والی سبزیاں تھیں اور ایک کونے میں کیاریاں بنا کر دھنیہ، پودینہ وغیرہ لگائے گئے تھے۔ باہر کو جاتی ہوئی بغلی کاریڈور میں انگور کے ساتھ ساتھ کچھ سبزیوں کی بیلیں بھی تھیں۔ میں نے تعریف کی تو بولے: ''میرا باورچی بھگوان داس ہی میرا مالی بھی ہے۔ اِس پلاٹ کی

دیکھ ریکھ بھی اُسی کے ذمہ ہے۔'' یہاں یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ کھوسلا صاحب کی اہلیہ اور بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہو قریب ہی اپنے میکے میں رہتی ہیں جب کہ بیٹی وسندھرا دہلی میں بیاہی ہیں۔ تاہم کھوسلا صاحب کا گھر کسی مہمان سے کم ہی خالی ہوتا ہے۔ ہمارے قیام کے دوران بھی وسندھرا، جنھیں سب پیار سے ''وسّو'' کہتے ہیں، اور اُن کے شوہر وِوِک دہلی سے خصوصی طور پر آئے ہوئے تھے جن کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

سنگیت سمیلن کے لیے ہمارے چار روزہ قیام کو کھوسلا صاحب نے اس خوبصورت انداز میں ترتیب دیا تھا کہ لطف آ گیا۔ بظاہر اس نوعیت کی مہمانداری کے لیے مالی وسائل اور سماجی تعلقات ہی کافی سمجھے جاتے ہیں لیکن اگر ان میں خلوص اور حسنِ ذوق کی آمیزش بھی ہو جائے تو مہمانوں کے لیے یہ دن ناقابلِ فراموش ہو جاتے ہیں۔ کھوسلا صاحب کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

دعوت نامے کے مطابق لاہور سے آنے والے تمام مہمانوں کے لیے ہوٹل اروما میں کمرے بُک کروا دیے گئے تھے جہاں اُنھیں اپنے خرچ پر قیام کرنا تھا۔ واضح رہے کہ ابتدائی طور پر لاہور سے مدعو کیے جانے والا وفد سینتیس افراد پر مشتمل تھا لیکن روانگی کے دن صرف چھے افراد ہی بہم ہو سکے۔ سجن نگر سے رشیدہ، سعدیہ اور ارم؛ آل پاکستان میوزک کانفرنس سے ڈاکٹر غزالہ عرفان، ادبی و ثقافتی امور میں ہر دم متحرک قاسم جعفری اور میں۔ بیلا رضا اور طارق جمیل پہلے سے ہندوستان میں تھے جنھیں سمیلن کے دِن ہمیں وہیں آ ملنا تھا۔

لٰہذا جمعرات کی شب کھوسلا صاحب کے ہاں رات کے کھانے کے بعد پتہ چلا کہ ہمارے قیام کا پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ رشیدہ، سعدیہ اور ارم، کھوسلا صاحب کے گھر میں رہیں گی، قاسم اور میں اُن کے بھتیجے وشال کے ہاں جب کہ ڈاکٹر غزالہ کے لیے

کھوسلا صاحب کے فیملی فرینڈ مِتّل صاحب کے گھر رہنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ وشال اور مِتّل کے گھر کھوسلا صاحب کے گھر سے آٹھ دس منٹ کی ڈرائیو پر واقع تھے۔ کھانے کے بعد وِوِک اور اُن کی اہلیہ وسو ہمیں اپنی اپنی جائے قیام پر پہنچا آئے۔

◆◆◆

پنچکلا اور چنڈی گڑھ

شام ڈھل رہی تھی جب ہم چنڈی گڑھ پہنچے۔ سب کے چہروں سے تھکن عیاں تھی نیز یہ فکر بھی دامنِ گیر تھی کہ ہمارے میزبان کھوسلا صاحب ہماری اس تاخیر سے یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔ سرحد عبور کرنے کے بعد اُن سے کوئی رابطہ بھی نہ ہو پایا تھا۔

تصویرِ شاہرات میں رنگ

چنڈی گڑھ شہر کے قریب پہنچتے ہوئے اُنہی مانوس مناظر سے سامنا ہوا جو ہمارے یہاں وسطی یا جنوبی پنجاب کے کسی بڑے شہر میں داخل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بس اڈوں کے قریب ٹریفک کا رش، چھوٹے موٹے تجارتی مراکز اور پولیس ناکے۔ فرق دیکھا تو بس یہ کہ پولیس ناکوں پر لیڈی پولیس اہلکار بھی اسی مستعدی سے ڈیوٹی انجام دے رہی تھیں جیسے اُن کے مرد کولیگ۔ معمول کے مطابق ایک جگہ ہماری کوسٹر بھی روکی گئی اور چیکنگ کے دوران میں نے یہ بات نوٹ کی نہ صرف خواتین اہلکاروں کا یونیفارم بالکل مردوں جیسا ہے بلکہ ہمارے ہاں کے برعکس فرائض کی انجام دہی میں بھی کوئی تخصیص نہیں۔

مختلف اضلاع میں بطور انتظامی مجسٹریٹ ملازمت کے دوران امن و امان قائم رکھنے کے سلسلے میں محکمہ پولیس سے میرا خاصا تعلق رہا ہے۔ ڈیوٹی چاہے محرم کی ہو یا اتوار بازار کی، سیلاب سے متاثرہ افراد میں ''وطن کارڈ'' کی تقسیم کا موقع ہو یا کوئی عرس

وغیرہ، لیڈی پولیس طلب تو کی جاتی ہے لیکن ''قابلِ معافی'' اہلکار ڈیوٹی پر تشریف نہ لا سکنے کا کوئی عذر پیش کر دیتی ہیں جو، ظاہر ہے، قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔ تاہم ''معافی'' کی حد سے گزر چکی اہلکار ڈیوٹی پر آتی تو ضرور ہیں لیکن الگ سایہ دار جگہ پر کرسیاں لگوا کر بٹھا دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھار کسی آتی جاتی خاتون کا پرس چیک کر لیا اور بس۔ لیکن یہاں تو وہ واقعی ''مردوں کے شانہ بشانہ'' کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ موٹر سائیکل سوار مرد کو بڑے رعب سے روک کر کاغذات چیک ہو رہے ہیں، ناکے پر روکی گئی گاڑی کی ڈگی کھلوائی جا رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لیڈی پولیس کو مردوں کے برابر ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے بعد میں بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ چندی گڑھ اور پنچکلا میں ہمارا قیام چوبیس اکتوبر سے ستائیس اکتوبر تک تھا۔ اس دوران چھبیس تاریخ کو ہریانہ کے نومنتخب وزیرِ اعلیٰ کی حلف برداری کی تقریب ہونا تھی جس کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ وزیرِ اعظم نریندر مودی کی خصوصی آمد کے باعث چندی گڑھ اور پنچکلا دونوں شہروں میں سیکورٹی کے سخت انتظامات کیے جا رہے تھے۔ ہمارا قیام پنچکلا میں تھا جب کہ سنگیت سمیلن کی تمام نشستیں چندی گڑھ میں واقع بھارتیہ ودیا بھون میں ہونا تھیں لہٰذا دن میں ایک دو بار پنچکلا سے چندی گڑھ ضرور آنا جانا ہوتا۔ اِس دوران سڑک پر دورویہ کھڑے سیکورٹی اہلکاروں کو دیکھتے تو اِن میں چالیس پچاس فیصد تعداد نوجوان لیڈی کانسٹیبلز کی نظر آتی جو وہی یونیفارم پہنے، وہی بندوق اٹھائے اپنی ڈیوٹی کے مقام پر اپنے مرد کولیگز کی طرح چاق و چوبند کھڑی ہوتیں۔ میں نے اس تمام منظر کو ہندوستان کی روز افزوں ترقی کے ایک مظہر کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اگر اکیسویں صدی میں کوئی ملک اپنی تقریباً نصف آبادی کو کام کرنے سے مفلوج یا گھروں میں محدود رکھنے کی کوشش کرے گا تو ترقی کی دوڑ میں اس کا پیچھے رہ جانا لازم ہے۔

پنچکلا

ہندوستان میں صوبے کے لیے ''سٹیٹ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پنچکلا، ہریانہ سٹیٹ میں ایک چھوٹا اور صاف ستھرا ضلع ہے۔ ہریانہ سٹیٹ سے متصل دوسری سٹیٹ ''یونین ٹیری ٹری'' (Union Territry) ہے جس کا صدر مقام چندی گڑھ ہے۔

مختلف صوبوں میں ہونے کے باوجود جغرافیائی لحاظ سے چندی گڑھ اور پنچکلا دونوں ضلع ایک دوسرے سے یوں متصل ہیں جیسے راولپنڈی اور اسلام آباد؛ بلکہ اِن کا تو باہمی فاصلہ بھی کم ہے، یہی کوئی چار پانچ کلومیٹر۔ پنچکلا ترتیب سے بسایا ہوا نیا شہر ہے اور تقریباً سارا ہی پوش ایریا پر مشتمل ہے۔ چندی گڑھ کی جو آبادی اس سے ملحق ہے وہ بھی سائز اور جدید طرزِ تعمیر کے باعث طبقۂ امرا کا علاقہ ہی معلوم ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی اجنبی غور سے بورڈ نہ پڑھے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب چندی گڑھ ختم ہوا اور پنچکلا شروع ہو گیا یا کب پنچکلا سے نکلے اور چندی گڑھ میں گھومنے لگے۔

کھوسلا صاحب نے قاسم اور میرے قیام کا بندوبست سیکٹر ۴ میں واقع اپنے بھتیجے وشال کے گھر پر کیا تھا۔ وشال اور اُن کی اہلیہ نوجوت کی پر خلوص مہمان نوازی نے محض چار دن میں ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس خوبصورت جوڑے اور اُن کی میزبانی کا ذکر اگلے باب میں ہوگا جو اُن کے تفصیلی تعارف اور حسنِ سلوک کے لیے مخصوص ہے، ابھی صرف اُن کے شہر پنچکلا کی باتیں!

جمعرات کی شب قاسم تو صبح گیارہ بجے تک اٹھنے کا کہہ کر سوئے تھے لیکن میں ذرا جلدی اٹھ گیا۔ کمرے سے باہر نکلا تو وشال چائے کا مگ ہاتھ میں لیے لابی میں نظر آ گئے۔ مجھے بھی ایک کپ پیش کیا۔ ہم کچھ دیر لان میں کھڑے سگریٹ پیتے رہے پھر وشال بولے کہ آئیں ذرا باہر کا چکر لگا کے آتے ہیں۔

میں اور وشال سیر کو نکلے اور قریباً آدھ گھنٹہ گلیوں میں گھومتے رہے۔ مجھے تو

پنچکلا کا یہ سیکٹر بالکل اسلام آباد کے ''جی سکس'' کی طرح لگا۔ اُسی طرح کھلی کھلی اور صاف ستھری پختہ گلیاں، چھوٹی مارکیٹ اور پھر کچھ فاصلے پر سیکٹر مارکیٹ۔ اگلے چار روز کے دوران چندی گڑھ جانے اور شاپنگ وغیرہ کے لیے مختلف راستوں سے آتے جاتے پنچکلا کے دوسرے سیکٹرز سے بھی گزرنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے اسے کافی حد تک اسلام آباد سے ملتا جلتا ہی پایا۔

آرتی

شام ڈھلے چندی گڑھ میں داخل ہونے کے بعد پنچکلا میں کھوسلا صاحب کے گھر پہنچنے میں ہمیں تقریباً آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ ڈرائیور بھی پنچکلا شہر کے اندرونی راستوں سے ناواقف تھا لہٰذا مکان ڈھونڈنے میں دشواری ہوئی۔ کھوسلا صاحب واقعی بہت پریشان تھے۔ ہماری کوسٹر رکنے پر گیراج میں موجود اُن کے ڈرائیور دیس راج نے اندر جا کر اطلاع کی تو انھوں نے اپنی بیٹی وسّو اور داماد وِوِک کے ساتھ خود گھر سے باہر آ کر ہمارا استقبال کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انگریزی محاورے with open arms کی صحیح وضاحت اسی دن ہوئی۔ سب لوگ اتنی محبت سے ملے کہ یقین نہیں آتا تھا ہم میں سے بعض کی یہ پہلی ملاقات ہے۔ دیوالی کی آرائش تو ہم بارڈر کراس کرتے ساتھ ہی دیکھتے آئے تھے اور رات پڑتے ساتھ ہی آرائشی قمقموں سے سجے گھر بھی دیکھ رہے تھے لیکن یہاں میزبانوں کا خلوص بھی دیدنی تھا۔ کھوسلا صاحب کہنے لگے کہ آج ہماری دیوالی کی خوشی دوگنی ہوگئی ہے کیونکہ ہمارے گھر لاہور سے مہمان آئے ہیں۔

لاؤنج کے دروازے کے ساتھ مختلف رنگوں سے بنی ایک خوبصورت رنگولی موجود تھی۔ ہم سب لحظہ بھر اُسے دیکھنے کو رکے تو کھوسلا صاحب کی بیٹی وسو گھر کے اندر سے ایک چھوٹا سا تھال لے آئیں جس میں دیسی گھی کے دِیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی

کٹوریوں میں چاول، زعفران اور پھولوں کی پتیاں وغیرہ رکھی تھیں جن سے آرتی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

بھگوان سنگھ کا ڈھابا

کوسٹر سے سامان اتارے جانے اور آرتی کی رسم ادا ہونے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ڈائننگ ٹیبل پر چائے تیار دھری تھی۔ چائے کے ساتھ کتنی ہی قسم کی مٹھائیاں بھی موجود تھیں لیکن سب کی سب مانوس اور انتہائی لذیذ۔ گلاب جامن، مونگ کی دال کی مٹھائی، پتیسہ، برفی، غرضیکہ ہر چیز اپنے ذائقے، رنگ اور خوشبو کے لحاظ سے لاجواب تھی۔ وسو نے بتایا کہ یہ دیوالی کی خصوصی مٹھائیاں ہیں۔ ارم چائے بنانے لگیں تو وسو نے حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے یہ فرض خود نبھایا۔ میں نے قہوے کا رنگ ہلکا سنہرا دیکھا تو جی ہی جی میں مایوس ہوا کیونکہ میں تیز چائے پینے کا عادی ہوں۔ سوچا کہ سارے دن بعد اب چائے ملی بھی تو بے رنگ اور بے ذائقہ! اتنی دیر میں میرے سامنے بھی کپ رکھ دیا گیا۔ میں نے پہلی چسکی لی تو رنگ پھیکا ہونے کے باوجود ذائقے میں تیزی محسوس ہوئی۔ دوسرا گھونٹ لیا تو پہلے تاثر کی تصدیق ہوئی۔ کھوسلا صاحب نے شاید میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے، بولے: ''یہ ہندوستان کی مشہور دارجلنگ ٹی ہے۔ امید ہے آپ کو لپٹن کی روایتی چائے سے مختلف محسوس ہو رہی ہوگی۔'' میں کھوسلا صاحب کی قیافہ شناسی کا قائل ہوگیا۔ چائے واقعی رنگ میں ہلکی لیکن ذائقے میں تیز تھی۔ میں نے بلا جھجک دوسرا کپ مانگ لیا اور سارے دن کے دوران چائے کی کمی اور تھکن دور کرنے کا سامان کرنے لگا۔

چائے کے دوران گاڑی خراب ہو جانے کے باعث دیر ہونے اور ٹیلی فونک رابطہ نہ ہو سکنے کی باتیں چلتی رہیں۔ چائے ختم کر کے میں حسبِ عادت سگریٹ پینے کے

لیے باہر لان میں آ گیا اور دیوالی کی آتش بازی سے محظوظ ہونے لگا۔ پٹاخوں کی گونج سن کر باقی سب لوگ بھی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر لان میں آ کھڑے ہوئے اور آسمان پر بکھرے رنگ ونور کے بادلوں کا نظارہ کرنے لگے۔

اس دوران وسّو ڈرائنگ روم اور رسوئی کے چکر لگاتی ہوئی کھانے کے متعلق ہدایات دیتی رہیں اور تھوڑی دیر بعد سب کو کھانے کی دعوت دینے لگیں۔ کھانے کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ وسّو اور اُن کے شوہر وِوِک بھارتی نے، جنھیں سب پیار سے 'بابو' کہہ کر بلاتے ہیں، اِن چار دنوں میں مہمان نوازی کی حد کر دی۔ اِس مثالی جوڑے کا تفصیلی تعارف اگلے باب میں ہوگا۔

لاؤنج کے تقریباً وسط میں لگی گول ڈائننگ ٹیبل پر برتن لگائے جا چکے تھے اور قریب ہی پڑی بڑی سی سائیڈ ٹیبل پر مختلف ڈشز میں کھانا چُن دیا گیا تھا۔ ابلے ہوئے سفید چاول، چکن بون لیس کری، آلو گوبھی، دال، شامی کباب، تازہ سلاد اور دہی پھلکی پر مشتمل کھانا انتہائی لذیذ تھا۔ وسّو جی کی نوجوان بیٹی بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوئیں۔ کھوسلا صاحب نے بڑے پیار سے اُن کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے ایتھنو میوزیکالوجی میں ماسٹرز کیا ہے اور سونی میوزک میں ملازمت کر رہی ہیں۔

سب نے کھانے کی تعریف کی تو کھوسلا صاحب یہ کریڈٹ اپنے خانساماں بھگوان داس کو منتقل کرتے رہے جو مسلسل گرم پھلکے اور تازہ شامی کباب لائے جا رہے تھے۔ کھانے کے بعد میٹھے کا دور چلا جس میں دیوالی کی مٹھائی کے ساتھ گھر کی بنی ہوئی کھیر بھی پیش کی گئی۔ سب نے ایک بار پھر تعریف کی تو کھوسلا صاحب اپنی مخصوص خوش مزاجی سے بتانے لگے کہ میں نے اپنی رسوئی کا نام ''بھگوان سنگھ کا ڈھابا'' رکھا ہوا ہے جہاں صبح چھ بجے سے رات دیر تک ''ویج'' اور ''نان ویج'' دونوں قسم کا کھانا ملتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ یہ بات کرتے کرتے رسوئی کے دروازے تک پہنچ چکے تھے

اور وہاں رومن ہندی میں لکھے اس نوٹس کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو دیوار پر نمایاں انداز میں چپکایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے موبائل فون سے فوراً اس نوٹس کی تصویر بنا ڈالی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، کھوسلا صاحب اپنی اہلیہ اور بیٹے کی وفات کے بعد اس گھر میں ڈرائیور دیس راج اور خانساماں بھگوان سنگھ کے ساتھ رہتے ہیں۔ بھگوان سنگھ کی فیملی بھی سرونٹ کوارٹر میں مقیم ہے۔ اِن چار دنوں میں ہم نے کھوسلا صاحب کے اپنے ملازموں کے ساتھ اچھے برتاؤ کے کئی نمونے دیکھے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ ان دونوں کو ''جی'' کا لاحقہ لگائے بغیر آواز نہیں دیتے تھے۔ جب بھی انھیں بلانا ہوتو 'بھگوان سنگھ جی' اور 'دیس راج جی' کہہ کر بلاتے تھے۔ اپنے یہاں کی سول سروس سے موازنہ کروں تو اہلِ پنجاب میں کم ہی کوئی ایسا افسر ہوگا جو دو تین ضلعوں کا ڈپٹی کمشنر رہنے کے بعد بطور ممبر بورڈ آف ریونیو ریٹائر ہوا ہو اور گھریلو ملازمین کو ''تم'' کے علاوہ کسی لفظ سے مخاطب کرتا ہو۔

بھگوان سنگھ جی کے ڈھابے کی سروس واقعی لاجواب تھی۔ ہم جتنے بھی دن وہاں رہے، سروس کے معیار اور فراہمی کی مقدار میں کمی نہیں آئی۔ چائے، کافی، کھانا ہر چیز کمال تھی۔ مثلاً اگلے روز دوپہر کے کھانے میں ابلے چاول، بھنڈی، ناریل اور کڑھی پتہ کے شوربے میں پکی مچھلی، ثابت مسور، لسی، تازہ سلاد، کھیرے کا رائتہ اور دھنیے پودینے کی چٹنی شامل تھے۔

ناگا مرچی

''بھگوان سنگھ جی! ناگا مرچی کہاں ہے؟'' وسّو پکاریں۔ ''ابھی لایا جی!'' بھگوان سنگھ بولے اور اگلی بار گرم پھلکے لاتے ہوئے ایک پلیٹ میں سبز مرچ بھی لیتے آئے۔ سبز مرچ کے بغیر میں بھی کھانا نہیں کھاتا۔ ایک اٹھائی تو وسّو جی نے خبردار کیا کہ احتیاط سے کھائیے گا، یہ دنیا کی تیز ترین سبز مرچ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے وسّو

کی بات کوسنجیدگی سے نہ لیا اور اگلے نوالے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ناگا مرچی کا بھی منہ میں رکھ لیا مگر اتنے ٹکڑے سے ہی ہوش ٹھکانے آ گئے۔ باقی کھانا ختم کرنے تک اگرچہ احتیاط نے لذت کو زیر کیے رکھا لیکن پوری مرچ پھر بھی ختم نہ کر سکا۔ کھوسلا صاحب اس ساری کارروائی کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''اگر آپ کو یہ مرچ پسند آئی ہے تو واپس جاتے ہوئے میں آپ کو اس کا ایک گملا یا اگر ممکن ہوا تو بیجوں کا ایک پیکٹ دے دوں گا۔ آپ اپنے ہاں اگائیے، گملے میں بھی اگ جاتی ہے۔'' افسوس کہ واپسی پر کھوسلا صاحب نے ہم سب کو مزید اتنے تحفوں سے لاد دیا کہ ناگا مرچی یاد دلانا مناسب معلوم نہ ہوا۔

دیوالی

ہندوستان میں ہماری آمد دیوالی کے دن ہوئی تھی۔ روایتی طور پر اس اہم مذہبی تہوار کی تقریبات چند دن جاری رہتی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے انڈین نیشنل تھیٹر چندی گڑھ کے زیرِ انتظام منعقد ہونے والے سینتیسویں سنگیت سمیلن کا اہتمام بھی اسی حوالے سے کیا گیا تھا۔ لہٰذا اپنے قیام کے دوران سنگیت سمیلن کی نشستوں کے علاوہ بھی ہم جہاں کہیں گئے، دیوالی کی تقریبات بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

سڑک کے راستے امرتسر سے پنچکلا آتے ہوئے دن بھر کے سفر کے دوران مٹھائی کی دکانوں کے علاوہ وائن شاپس کھلی تھیں یا گفٹ شاپس۔ سرِ شام گھروں اور تقریباً تمام بڑی عمارتوں پر برقی قمقموں اور آرائشی لائٹوں کا خصوصی انتظام دیکھنے میں آیا اور رات ہوتے ہی آتش بازی کا وہ طوفان کہ الاماں۔ چائے کے بعد سگریٹ پینے کے لیے میں کھوسلا صاحب کے لان میں کھڑا ہوا تو ہمسایوں کے لڑکے قسم قسم کے پٹاخے اور پھلجڑیاں چلا کر اپنے مذہبی جذبات کو تسکین پہنچا رہے تھے۔ لاہور سے آئے ہوئے باقی



مصنف طبلہ نواز اوپ بھو کو سٹیج پہ جا کر خیر مقدمی تحائف پیش کرتے ہوئے



پہلی قطار میں (دائیں سے بائیں): نونیون کھوسلا، رشیدہ رضا اور ڈاکٹر غزالہ عرفان



پہلی قطار میں (دائیں سے بائیں): وِوِک بھارتی، اُن کی اہلیہ وسندھرا چوہان اور دیگر حاضرین



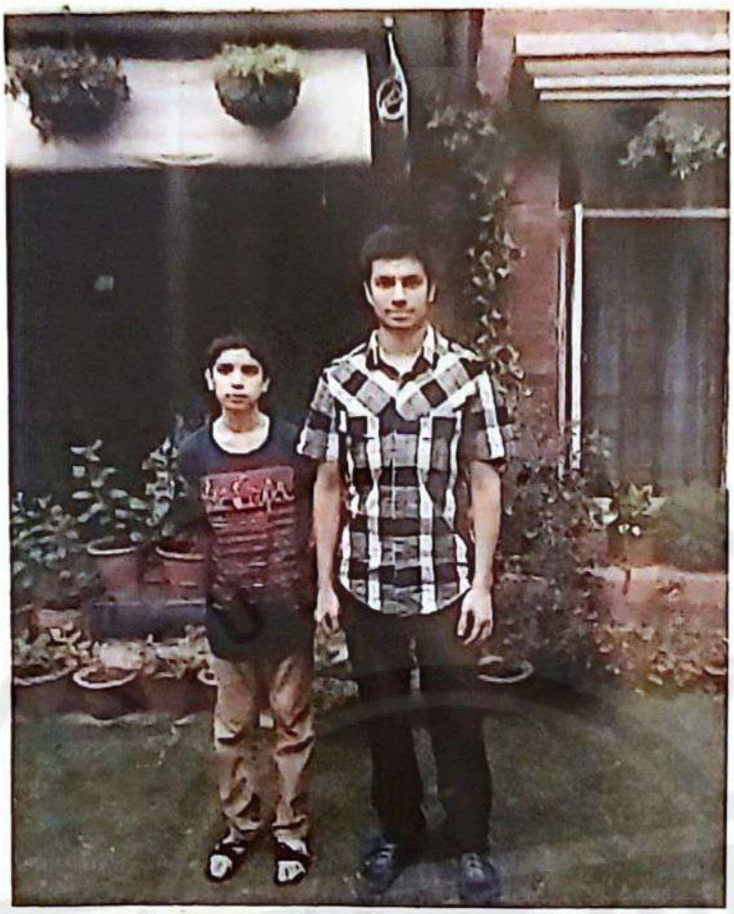
بھارتیہ ودیا بھون (چندی گڑھ) میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے حاضرین



منجوشا پاٹل راگ سوہنی پیش کرتے ہوئے، طبلے پر اوپربھو



وشال کے گھر کے داخلی برآمدہ، مصنف صبح کی چائے پیتے ہوئے



وشال اور نوجوت کے بیٹے سدھانت اور آنند



پہلی قطار میں (دائیں سے بائیں): نامعلوم، نوجیون کھوسلا، رشیدہ رضا (کیمرا درست کرتے ہوئے)،

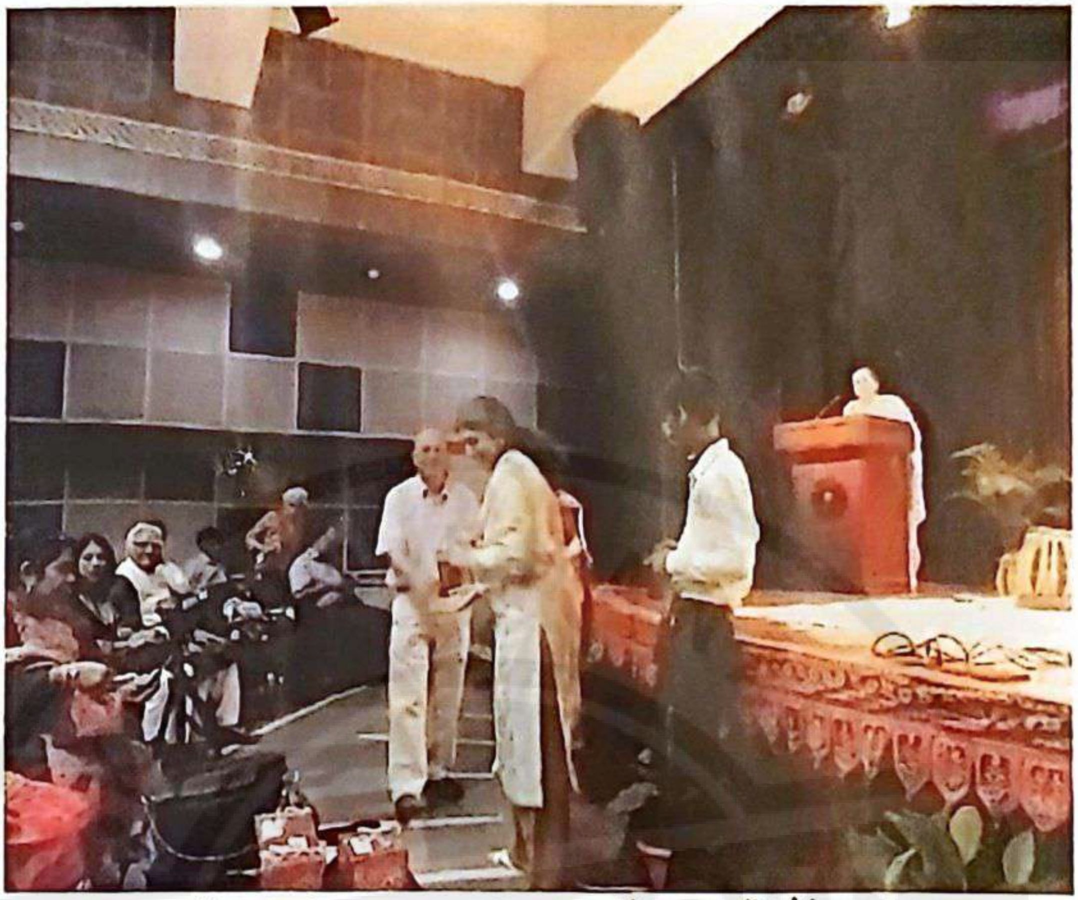
ڈاکٹر غزالہ عرفان، نامعلوم، سعدیہ طارق، ارم توقیر اور دیگر حاضرین



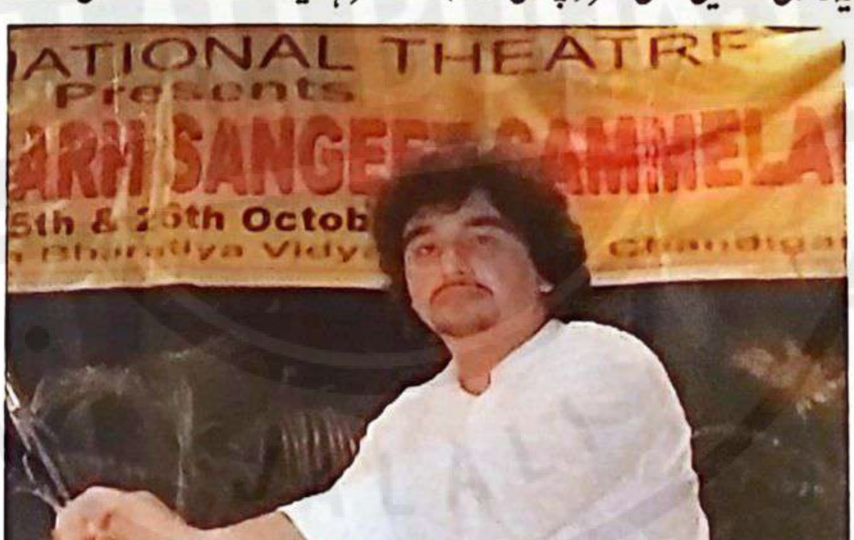
بیلا رضا، چسمیتا کو سٹیج پر جا کر خیر مقدمی تحائف پیش کرتے ہوئے



Flute Sisters



سعدیہ طارق، انڈین نیشنل تھیٹر (چنڈی گڑھ) کے سینئر عہدیدار سے تحائف وصول کرتے ہوئے



طبلہ نواز اوپر بھو



دیپو پریا اور سچشمیتا راگ آہیر بھیروں پیش کرتے ہوئے، طبلے پر اوپربھو



ایشوینی دیش پانڈے راگ جونپوری پیش کرتے ہوئے، طبلے پر اور پربھو اور ہارمونیم پر پارومیتا



سمیلن کے آخری دن بھجن گانے سے پہلے اشوینی دیش پانڈے تانپورہ ملاتے ہوئے
سٹیج پر سازندوں اور دیگر فنکاروں کے علاوہ ارم توقیر اور بانسری نواز بہنیں دیبا پریا اور سچسمیتا بھی نمایاں ہیں



لاہور واپسی پر اٹاری سے داخل ہوتے ہوئے
(دائیں سے بائیں): رشیدہ رضا، ارم توقیر، سعدیہ طارق اور ڈاکٹر غزالہ عرفان

مہمان اور میزبان بھی میرے ساتھ لان میں آ کھڑے ہوئے تو اُنھوں نے ایک بڑا سا انار کھوسلا ہاؤس کے مین گیٹ کے عین سامنے بھی لا رکھا اور اُس کے فتیلے کو آگ دکھا دی۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا انار بھی آسمان کی طرف تاحدِ نظر روشنی کی شعاعیں بکھیرتا رہا۔ اس دوران سامنے والے اور بائیں جانب کے پڑوسی بھی میدانِ عمل میں کودے اور شرلی پٹاخوں کا وہ طوفان برپا ہوا کہ پاس پاس کھڑے ہو کر بھی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ قریب کے علاوہ دور دراز سے اٹھنے والی اس قسم کی آوازوں نے ایسا شور مچایا کہ رات کے کھانے کا بلاوا سن کر جی کو ذرا اطمینان ہوا کہ کمرے کے اندر جا کر یہ آوازیں کچھ تو کم ہوں گی۔

دیوالی کے ثقافتی اور فنی پہلوؤں میں سے مجھے ''رنگولی'' نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ کھوسلا صاحب کے گھر بنی چھوٹی سی خوبصورت رنگولی اُن کے خانساماں بھگوان سنگھ کے بچوں نے بنائی تھی۔ ہوٹل اروما میں مور کی شکل کی بنی رنگولی سائز میں کہیں بڑی تھی۔ اسی طرح بھارتیہ ودیا بھون میں، جہاں سنگیت سمیلن منعقد ہونا تھا، بنی رنگولی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ میں نے اِن سب کی تصویریں اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیں۔

راک گارڈن

سنگیت سمیلن کا افتتاح جمعہ ۲۴ اکتوبر کو شام چھے بجے ہونا تھا۔ کھوسلا صاحب نے وشال کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ دوپہر کے کھانے سے پہلے اپنے مہمانوں یعنی قاسم اور مجھے ''راک گارڈن'' کی سیر کروا لائے۔ لہٰذا نوجوت بھابی کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے لذیذ پراٹھوں، آملیٹ، ترکاری، اچار اور پھل سے ناشتہ کرنے کے بعد وشال اپنی گاڑی میں قاسم اور مجھے کھوسلا صاحب کے ہاں لے آیا۔ ایک بار پھر چائے کا دور چلا اور ہم تینوں راک گارڈن روانہ ہو گئے۔

راک گارڈن اپنی طرز کا ایک عجوبہ ہے۔ نیا شہر بساتے ہوئے سڑکوں، پلوں اور عمارتوں وغیرہ سے بچ رہنے والے بلڈنگ مٹیریل، گھروں سے باہر پھینک دیے جانے والے بے کار ساز و سامان، کاٹھ کباڑ اور ہر قسم کی دیگر فاضل اشیا سے بنا ہوا یہ ''گارڈن'' پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ چندی گڑھ کے روڈ انسپکٹر نیک چند کی تخلیقی سوچ کا شاہکار ہے۔ موجودہ صورت میں تقریباً چالیس ایکڑ پر پھیلے اس پارک کی تعمیر کا قصہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔

دفتری اوقاتِ کار ختم ہونے کے بعد فارغ وقت گزارنے کے لیے نیک چند کا ایک عجیب مشغلہ تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت شہر سے باہر جنگل میں عارضی طور پر بنے وسیع سٹور میں گزارتا جہاں اس کے محکمے اور شہر والے اپنا زائد ساز و سامان اور کاٹھ کباڑ پھینک جایا کرتے تھے۔ دراصل تقسیمِ ہند کے بعد چندی گڑھ کو بھارت کے پہلے ''ماڈل سٹی'' کے طور پر بسانے کے لیے ایک فرانسیسی آرکیٹکٹ لی کوربوزیرؔ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ پرانی عمارتیں گرانے اور نئی تعمیر ہونے والی سڑکوں، عمارتوں اور پلوں وغیرہ کی تعمیر سے بچ رہنے والے سیکڑوں ٹن وزنی سامان کو روزانہ اسی سٹور میں پھینک دیا جاتا۔ آہستہ آہستہ میونسپلٹی اور انفرادی طور پر کاٹھ کباڑ پھینکنے والے شہری بھی اسی جگہ کو ایک بڑی Dumping Place کے طور پر استعمال کرنے لگے جہاں ایک بڑی مقدار میں جمع ہونے والے سامان میں اشیا کا تنوع انتہائی عجیب و غریب تھا: سریا، اینٹ، بجری، روڑی، بجلی کے سوئچ، کموڈ، واش بیسن، ٹونٹیاں، چوڑیاں، بوتلیں، مختلف پیشوں کے اوزار، کراکری، صاف پانی اور سیوریج کے پائپ، بڑے چھوٹے پتھر، قسم قسم کی مورتیاں اور مجسمے، بجلی کی تاریں، کھمبے، ٹرانسفارمر......اور نجانے کیا کیا کچھ!

نیک چند اپنے فارغ وقت میں بظاہر فضول اور بے کار اشیا کے اس ہجوم کو اپنے ذہن میں موجود ایک خیالی نقشے کے مطابق ترتیب دینے لگا اور منوں ٹنوں کے

حساب سے روزانہ وہاں آنے والے کاٹھ کباڑ کو جنگل کا قدرتی حسن خراب کیے بغیر ایک عجیب سلیقے سے سجاتا رہا۔ محکمہ پی ڈبلیو ڈی کے افسران کو شاید اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ کبھی اس سٹور کا دورہ کریں اور پڑے ہوئے سامان کی تفصیل کے بارے میں پوچھیں۔ اُن کے لیے تو شاید اتنا ہی کافی ہوگا کہ نیک چند نامی ایک روڈ انسپکٹر اُس سٹور کے اندر ہی رہتا ہے اور اسم با مسمیٰ ہونے کے باعث وہ خود سامان میں ہیرا پھیری کرے گا نہ کسی اور کو اس کی اجازت دے گا۔ مگر نیک چند جی اندر ہی اندر ''سرکاری سامان'' کو مجاز اتھارٹی کی اجازت کے بغیر ''ذاتی استعمال'' میں لا رہے تھے جو کہ قانوناً جرم ہے!

اب اسے چندی گڑھ کی خوش قسمتی کہیے یا نیک چند کی نیک نیتی کہ کاٹھ کباڑ کے ان ڈھیروں کے قریب ہی جنگل میں ایک قدرتی گھاٹی بھی تھی جس پر ۱۹۰۷ء کے ماحولیاتی قوانین کے تحت کوئی تعمیر کرنا خلافِ قانون تھا مگر نیک چند نے چھپے چوری اس گھاٹی کو بھی اپنے ''خوابوں کے محل'' میں سمو لیا! نتیجۃً ۱۹۷۵ء تک پی ڈبلیو ڈی کا یہ سٹور تیرہ ایکڑ پر مشتمل اپنی نوعیت کا منفرد پارک بن چکا تھا جس میں آبشاریں، پختہ اور کچی روشیں، آرائشی مجسمے اور بیٹھنے کے لیے بنچ وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ نیک چند کی تخلیقی اپج نے ضائع شدہ، بے کار اور ناقابلِ استعمال سامان کو استعمال کرتے ہوئے ڈیزائننگ، آرکیٹکچر اور سول انجینئرنگ کا ایک عجیب شاہکار دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

یورپی آرکیٹکٹ کے ہاتھوں جدید خطوط پر تعمیر ہونے والے نئے شہر چندی گڑھ سے کچھ دور جنگل کے بیچوں بیچ اس سٹور کے پارک میں تبدیل ہونے کی خبر کہاں تک چھپی رہنا تھی۔ جب آتے جاتے لوگ اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے رکنے لگے تو سرکار کے کان پر بھی جوں رینگی۔ رپورٹ، شکایت، انکوائری، موقع ملاحظہ اور چارج شیٹ وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بالآخر روڈ انسپکٹر نیک چند کو محکمانہ انضباطی کارروائی میں دھر لیا گیا۔ تاہم اُس وقت تک اِس پارک کی شہرت دنیا بھر میں پھیل چکی تھی۔ رائے

عامہ نیک چند کے حق میں ہموار ہونے پر ''راک گارڈن'' کا ایک بار پھر تفصیلی جائزہ لیا گیا اور اُسے مفادِ عامہ کے لیے ایک اہم اِقدام قرار دیتے ہوئے نیک چند کو ملازمت پر بحال کر کے ایس ڈی او کا اعزازی عہدہ اور پچاس مزدور دیے گئے تا کہ وہ باقی ماندہ کام بھی مکمل کر لے۔

۱۹۷۶ء میں اس عوامی پارک کا رسمی طور پر افتتاح ہوا اور ۱۹۸۳ء میں اس کی تصویر والا ٹکٹ بھی جاری کیا گیا۔ ملکی سطح پر نیک چند کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۸۴ء میں اسے ''پدم شری'' سے نوازا گیا۔ جب کہ عالمی سطح پر اُس کی پذیرائی پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں اُسے متعدد بیرونی ممالک میں لیکچرز کی دعوت بھی دی گئی جہاں اُس نے کاٹھ کباڑ کے ڈھیروں کو پارک میں بدلنے کے تجربے کی وضاحت کی۔ تحصیل شکر گڑھ کے گاؤں بیریاں کلاں میں ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کو جنم لینے والے نیک چند نے ۱۲ جون ۲۰۱۵ء کو نوے برس کی عمر میں چندی گڑھ میں وفات پائی۔

وشال اور قاسم کے ہمراہ راک گارڈن کی یہ سیر بڑی دلچسپ اور یادگار رہی۔ قاسم تو خیر اپنی فیملی کے ہمراہ پہلے بھی آ چکے تھے مگر مجھے اس پارک میں گھومنا اور اس کی تشکیل و تعمیر کی کہانی جاننا بڑا اچھا لگا۔

ہوٹل اروما

ہفتہ ۲۵- اکتوبر کو انڈین نیشنل تھیٹر کی طرف سے ہمارے اعزاز میں خصوصی لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چندی گڑھ کے قدیم ترین ہوٹل اروما میں دیا گیا یہ لنچ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا جس میں انڈین نیشنل تھیٹر کے ارکان کے علاوہ فنِ موسیقی کے حوالے سے چندی گڑھ کی معروف شخصیات نے بھی شرکت کی۔ ہمارے وفد کے دو اور رکن بیلا رضا اور اُن کے شوہر طارق جمیل بھی، جو پہلے سے ہندوستان میں تھے، یہیں آن ملے۔

اس کے علاوہ سینتیسویں سنگیت سمیلن کے تینوں دن فن کا مظاہرہ کرنے والے تمام فنکار بھی کھانے پر مدعو تھے۔ خوب گہما گہم رہا۔

ہوٹل ارو ما بھی چندی گڑھ شہر جتنا ہی قدیم ہے۔ ۱۹۵۳ء میں بننے والے اس ہوٹل کو چندی گڑھ کے عمدہ ترین ہوٹلوں میں قدیم ترین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جواہر لعل نہرو اور مارشل ٹیٹو سمیت متعدد ملکی اور غیر ملکی وی آئی پیز یہاں قیام کر چکے ہیں۔ چندی گڑھ میں پہلا ایئر لائن آفس، پہلی ٹیکسی سروس، پہلی کوریئر کمپنی اور پہلی فلورل شاپ بھی اسی ہوٹل میں قائم ہوئیں۔ ہر قسم کی معیاری سروسز کے لیے یہ ہوٹل خاصا معروف ہے۔

ڈشز کی ورائٹی اور ذائقہ دونوں ہی خوب تھے۔ دال مکھنی، بھنا ہوا مٹن، ویجی ٹیبل بریانی، چکن تکہ، مکس سبزی، دہی بڑے اور تازہ تنوری روٹی سبھی لاجواب تھے لیکن مجھے سب سے زیادہ لطف ''پنیر بھرجی'' نامی ڈش کھا کر آیا۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا لذیذ بھنا ہوا مٹن لاہور میں بھی کم ہی کھایا ہوگا۔

ہوٹل کے سکھ منیجر کھوسلا صاحب کے دوست تھے۔ لاہور سے آئے ہوئے مہمانوں کی عزت افزائی کے لیے خود آ کر کھانے میں شامل ہوئے اور عملے کو وقتاً فوقتاً ہدایات دیتے رہے۔ قاسم جعفری سے تعارف ہوا تو ''پیٹی بھائی'' نکل آنے پر اُن سے کافی دیر پیشہ ورانہ موضوعات پر گپ شپ کرتے رہے۔

کھانے کے دوران ایک سکھ جوڑے سے میری خوب گپ شپ ہوئی۔ ابتدائی تعارف میں یہ جان کر کہ میں لاہور سے ہوں، اُنھوں نے بتایا کہ اُن کے خاندان نے فیصل آباد سے ہجرت کی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اپنے زمانے کے لائلپور کے لیے فیصل آباد کا نام بڑی سہولت سے ادا کر رہے تھے ورنہ یہاں سے ہجرت کر جانے والے بیشتر لوگ ہمارے برعکس اِسے ابھی تک لائلپور ہی کہتے ہیں۔ سردار جی کو اپنے پرانے شہر کی صرف ایک جگہ ''پیر لسوڑی شاہ'' یاد رہ گئی تھی۔

گڈی آنٹی

جمعے کی شام سمیلن کی افتتاحی تقریب سے پہلے قاسم اپنے کسی سردار دوست کی پھپھو کے ہاں جانا چاہتے تھے۔ وشال سے بولے کہ بھارتیہ ودیا بھون کے بجائے اطہر اور مجھے اُن کے ہاں ڈراپ کر دینا۔ بوا جی کا ڈرائیور ہمیں فنکشن میں پہنچا دے گا۔ وشال ایڈریس دیکھ کر کہنے لگا یہ تو بھارتیہ ودیا بھون سے پانچ منٹ کا پیدل راستہ ہے۔ آپ کو وہاں آنے میں دقت نہیں ہوگی۔

سہ پہر کی چائے کے بعد جب وشال اور نوجوت اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ اُن کے نانا نانی کو دیوالی کی مبارک باد دینے کے لیے روانہ ہوئے تو قاسم اور مجھے بھی ساتھ لے لیا اور قاسم کے بتائے ہوئے ایڈریس پر ڈراپ کر کے آگے چلے گئے۔

گھر کے باہر سے ہی سلیقہ اور خوبصورتی عیاں تھی۔ گھنٹی بجائی تو در و دیوار کی خوبصورتی سے بھی سیکڑوں درجے زیادہ خوبصورت معمر خاتون باہر نکلیں۔ قاسم اور مجھے پیار دیا اور کھلی ڈلی پنجابی میں حال چال پوچھتے ہوئے ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ ہمیں بٹھا کر بولیں: ''میں اونہاں نوں دس کے آنی آں۔'' گھر کے اندر سے راگ ہنس دھن میں کچھ گانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے قاسم کا شکریہ ادا کیا کہ مجھے کیسے باذوق لوگوں کے گھر میں لائے ہیں۔

قاسم بتانے لگے کہ آنٹی سے اُن کی ملاقات کچھ برس پہلے جالندھر میں اپنے ایک سردار دوست کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ہوئی تھی۔ پھر ایک دو شادیوں پر بھی ملنا رہا۔ میں نے سوچا قاسم کے خلوص اور ملنسار طبیعت نے میری طرح اس فیملی کو بھی یقیناً اپنا گرویدہ بنا لیا ہوگا۔ قاسم اور آنٹی کو باتوں میں محو دیکھ کر میں تصویر بنانے لگا تو قاسم فوراً بوا جی کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہا: ''اس طرح تصویر بنایئے۔'' بوا جی اصرار کرتی رہیں کہ میرے ساتھ بیٹھو مگر قاسم نہ مانے۔ بالآخر میں نے کہا کہ دونوں طرح ایک ایک تصویر بنا لیتے ہیں۔

قاسم نے اُن کی صحت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں کہ اب میری عمر چوراسی برس ہو چکی ہے اور گرو جی کی کرپا سے کوئی مرض وغیرہ نہیں ہے۔ اس پر قاسم کہنے لگے کہ چند برس پہلے تو آپ نے فلاں بھانجے کی شادی میں پنجاب کا روایتی ناچ ''گِدھا'' بھی ڈالا تھا۔ مسکرا کر کہنے لگیں: ''ہاں! لیکن اب تھک جاتی ہوں۔'' اس پر قاسم نے ساتھ والے لاؤنج سے آتی گانے کی آواز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی موسیقی سن کر تو انسان بوڑھا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا یہ ریکارڈنگ مل سکتی ہے؟ اتنے میں پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک سردار جی کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے: ''نہیں، یہ تو دربار صاحب امرتسر سے براہِ راست کیرتن نشر ہو رہا ہے۔'' میرے منھ سے بے اختیار واہ نکلی۔ قاسم نے میری طرف دیکھا: ہزار گونہ سخن در دہان ولب خاموش!

چائے سے پہلے اُن کا ملازم انتہائی لذیذ پکوڑے اور پھر گرم گرم گلاب جامن لے آیا۔ قاسم نے گوبندر سنگھ جی سے میرا تعارف کروایا۔ جواباً سردار جی اپنے بارے میں بتانے لگے کہ وہ تقریباً بیس برس قبل آرمی سے بطور بریگیڈیئر ریٹائر ہوئے تھے۔ انجینئرنگ کور کا حصہ رہنے کے باعث ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آرمی کے ذیلی اداروں میں بطور انجینئر کام کرتے رہے ہیں۔ میرے لیے زیادہ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اُن کا تعلق شاہکوٹ کے نزدیک ایک گاؤں چک ۵۱ سے تھا جسے وہ ضلع شیخوپورہ کا حصہ بتا رہے تھے۔ مجھے اپنے یہاں کے کئی بزرگ یاد آئے جو ابھی تک تحصیل شکر گڑھ کو ضلع سیالکوٹ اور تحصیل پھالیہ کو ضلع گجرات کا حصہ ہی سمجھتے ہیں۔ جب میں نے اُن سے عرض کیا کہ ننکانہ صاحب کے ضلع بن جانے کے بعد شاہکوٹ اُس کی ایک تحصیل ہے تو کہنے لگے کہ ہاں کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ ننکانہ صاحب سے ہو کر آنے والے کسی سکھ زائر نے یہ ذکر کیا تھا۔ باتوں کے دوران مسز گوبندر سنگھ باورچی خانے کا چکر لگانے چلی گئیں۔

بریگیڈیئر صاحب کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ کہنے لگے کہ میں بھی انڈین نیشنل تھیٹر کا رکن اور موسیقی کا شیدائی ہوں لیکن آج طبیعت اتنی خراب ہے کہ سمیلن کے افتتاحی پروگرام میں بھی نہیں آسکوں گا۔ بڑی معذرت کرتے ہوئے واش روم چلے گئے۔ میں نے قاسم سے مسز گوبندر کی تعریف کی تو کہنے لگے کہ ان کا تعلق پھلروان (ضلع سرگودھا) سے ہے اور پوری فیملی اِن کو ''گڈی آنٹی'' کہہ کر پکارتی ہے۔ اتنے پرانے اور نزدیکی تعلق کے باوجود مجھے بھی ان کا اصل نام معلوم نہیں۔ ''لیکن یہ نام تو اُن کی شخصیت کے لحاظ سے موزوں ترین ہے''، میں نے کہا۔ ''اسی لیے شاید!'' قاسم بولے۔

در جوانی چنانکہ اُفتد دانی

گوبندر سنگھ جی واش روم سے واپس تشریف لائے اور بتانے لگے کہ میٹرک کے بعد وہ ایک سال ایف سی کالج لاہور میں بھی پڑھتے رہے تھے۔ پھر تقسیم ہوگئی اور ہندوستان آکر وہ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ وہ ایف سی کالج کے حوالے سے لاہور میں گزارے ہوئے اپنے ایامِ جوانی کو بڑی محبت سے یاد کرتے رہے۔ بین السطور کچھ ایسی لغزشوں کا ذکر بھی کیا جن کے باعث اُن کے بزرگ اپنے نوجوان صاحبزادے کو کالج سے جلد اٹھوا لینے پر مجبور ہوئے تھے؛ تقسیم اور ہجرت تو محض بہانہ بن گئی۔

چھ بجنے والے تھے۔ ہم نے اجازت چاہی تو گڈی آنٹی اور بریگیڈیئر صاحب نے بڑے پیار سے الوداع کہا اور اُن کا ڈرائیور ہمیں بھارتیہ ودیا بھون پہنچا گیا۔

سواگت ریسٹورنٹ

سنگیت سمیلن کے دوسرے دن وشال نے قاسم اور مجھے بھارتیہ ودیا بھون ڈراپ کیا تو کھوسلا جی نے اُسے کہہ دیا کہ آج تمھارے مہمان رات دیر سے واپس آئیں گے۔ وشال بولے کہ نوجوت نے تو آج اِن کے۔ لیے خصوصی ڈنر کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ مگر

کھوسلا صاحب بولے کہ آج ہم نے انھیں ''سواگت ریسٹورنٹ'' سے ساؤتھ انڈین کھانا کھلانا ہے۔ وشال نے بڑے ادب سے ''اچھا تایا جی'' کہا اور واپس ہو لیے۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم گیارہ لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر قریب ہی مدھیہ مارگ پر واقع ''سواگت ریسٹورنٹ اینڈ بار'' پہنچے۔ یہ ڈنر انڈین نیشنل تھیٹر کی طرف سے نہیں بلکہ کھوسلا صاحب کی اپنی جانب سے تھا جس میں لاہور سے آٹھ مہمانوں کے علاوہ صرف اُن کی فیملی کے تین لوگ یعنی وہ خود، اُن کی بیٹی وسّو اور اُن کے شوہر وِوِک شریک تھے۔

ساؤتھ انڈین کھانوں کے لیے مشہور یہ ریسٹورنٹ چندی گڑھ کے پوش علاقے میں واقع ہے جہاں کانٹی نینٹل، چائنیز اور روایتی انڈین کھانے بھی دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ بار بھی ہے اور عقب میں ڈسکو بھی! ہمارے لیے نسبتاً درمیان میں ایک بڑی میز مخصوص کروائی گئی تھی۔ اگرچہ میرے علاوہ لاہوری وفد میں سے چند لوگ ساؤتھ انڈین فوڈ سے واقف تھے لیکن مینیو سے ڈشز منتخب کر کے آرڈر دینے کی ذمہ داری سب نے وسّو جی کو سونپ دی جنھوں نے وِوِک کے مشورے سے ہمیں بڑا یادگار کھانا کھلوایا۔ ڈشز میں اتنی زیادہ ورائٹی اور ایسا ایسا منفرد ذائقہ جس کا جواب نہیں۔ ساؤتھ انڈین کھانوں میں سرخ مرچ تیز ہوتی ہے لیکن ڈشز کے مجموعی مزاج کا حصہ لگتی ہے اور بری معلوم نہیں ہوتی۔ ہم نے دو طرح کی مچھلی کھائی، ایک بھنی ہوئی اور دوسری مصالحے میں پکی ہوئی۔ اس کے علاوہ مرغ کی کئی ڈشز تھیں۔ پران بھی منگوائے گئے اور کئی قسم کی چٹنیاں بھی جو اِن کھانوں کا جزو ہیں۔

ایک ڈش دال کی بھی تھی جس میں چار دالیں مونگ، مسور، چنا اور ماش ملائی گئی تھیں مگر حلیم کی طرح گھوٹا نہیں گیا تھا۔ ذائقہ مناسب تھا لیکن لہسن کا تڑکا ذرا زیادہ لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میٹھے میں گلاب جامن کھائے گئے۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو سامنے پان والا بیٹھا تھا۔سب نے پان کھائے۔ ہندوستان میں پان کی بھی کافی ورائٹی ہوتی ہے۔سامنے دو تین قسم کے پتے پڑے ہوتے ہیں۔کھانے والا خود بتاتا ہے کہ اُس نے بھا گلپوری پتے کا پان لگوانا ہے، بنگالی پتے کا یا بنارسی پتے کا۔سب نے پان کا خوب لطف اٹھایا۔واپس آتے ہوئے رشیدہ نے بتایا کہ سوموار کو امرتسر کے لیے صبح ساڑھے سات بجے کی سیٹیں ریزرو ہو چکی ہیں۔

◆◆◆

وشال اور نوجوت

لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے تو ہمیں یہی پتہ تھا کہ چندی گڑھ میں ہمارا قیام ہوٹل اروما میں ہوگا مگر وہاں پہنچ کر رات کھانے پر کھوسلا صاحب نے بتایا کہ قاسم اور میں اُن کے بھتیجے وشال کے گھر ٹھہریں گے جو ساتھ والے سیکٹر میں رہتے ہیں۔ اپنے شریک میز بان کا تعارف کرواتے ہوئے وہ کہنے لگے: ''وشال مکینیکل انجینئر ہے جب کہ اس کی بیوی نوجوت ڈینٹسٹ ہے لیکن دونوں اپنا اپنا فیلڈ چھوڑ کر پنچکلا میں ایک گفٹ شاپ چلاتے ہیں۔'' اپنے نئے میز بانوں کے بارے میں میرا تجسس بڑھ گیا۔ کھانے کے بعد دیوک اور وسو ہمیں وشال کے ہاں چھوڑ آئے۔

دیوالی کی خصوصی آرائش گھر کے در و دیوار سے نمایاں تھی۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک خوبصورت سا باغیچہ اور سامنے گیراج میں ایک بڑی جیپ اور کار کھڑی تھیں۔ گھنٹی بجانے پر کوئی باہر نہ آیا تو وسّو نے اپنے موبائل فون سے کوئی نمبر ملایا: ''دروازہ تے کھولو وشال جی تہاڈے پروہنے آئے نیں۔'' تھوڑی ہی دیر میں درمیانی عمر اور قد کے ایک صاحب ہاتھ میں فون پکڑے گھر سے برآمد ہوئے۔ ہم سب کو نمستے کیا اور گھر کے اندر لے گئے۔

ڈرائنگ روم میں تین مہمان بیٹھے تھے جن میں ایک سردار جی بھی تھے۔ مشروبات کا دور چل رہا تھا۔ سامنے میز پر قسم قسم کی مٹھائیاں، دیوالی کے تحائف اور دیگر

لوازمات رکھے تھے۔ ہمارا تعارف کروانے کے بعد وسّو نے اجازت چاہی تو وشال روکنے لگے کہ کچھ دیر بیٹھ جائیں۔ اتنے میں وشال کی اہلیہ نوجوت بھی آ گئیں اور اصرار کرنے لگیں تو وسّو نے بتایا کہ باہر گاڑی میں وِوِک اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ وشال اور نوجوت اُن کو گاڑی تک چھوڑنے جانے لگے تو بولیں، آپ اپنے مہمانوں کا خیال رکھیں، میں چلتی ہوں۔

سردار جی کے علاوہ دونوں دوسرے مہمان وشال سے کوئی کاروباری موضوع ڈسکس کر رہے تھے۔ انھوں نے بھی لاہور سے آنے والے مہمانوں کو بڑی محبت سے ویلکم کہا اور تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گئے۔ سردار جی البتہ نوجوت سے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران دو بچے بھی آ کر ہمیں نمستے کر گئے۔ ایک کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس اور دوسرے کی گیارہ بارہ برس ہوگی۔ وشال نے تعارف کروایا کہ یہ اُن کے بیٹے سدھانت اور آنند ہیں۔ ایک اے لیول کا طالب علم ہے اور دوسرا ساتویں جماعت کا۔

کھوسلا صاحب کے حوالے سے تعارفی گفتگو چلتی رہی۔ وشال نے بتایا کہ کھوسلا صاحب اس کے سگے تایا ہیں۔ نوجوت بولیں کہ جب تایا جی نے ہمیں کہا کہ میرے دو مہمان آپ کے ہاں ٹھہریں گے تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنے مہمانوں کو ہوٹل کے مصنوعی ماحول سے بچا کر ہمارے گھر ٹھہرانا پسند کیا ہے۔ نچلی منزل پر ہمارے دونوں بیڈ روم آپ کے لیے حاضر ہیں۔ پھر کھانے کا پوچھا تو ہم نے بتایا کہ کھا چکے ہیں اور اب سارے دن کے سفر کے بعد صرف آرام کی طلب ہے۔ وشال اور نوجوت ہمیں ساتھ لے کر کمروں کی جانب بڑھے تو سردار جی بھی ست سری اکال کہہ کر رخصت ہو گئے۔

قاسم اور میرا کمرہ آمنے سامنے تھا۔ درمیان میں ایک کھلی سی لابی تھی، جس میں سے اوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ کمرے دکھاتے ہوئے وشال اور نوجوت نے

بہ اصرار کہا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتایئے گا۔ جس پر میں نے چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ نوجوت بولیں: ''کیوں نہیں اطہر بھائی! کیسی چائے پئیں گے آپ؟ مکس، قہوہ اور دودھ الگ الگ یا ٹی بیگ والی؟'' میں نے ٹی بیگ والی کہی تو وشال بولے: ''ایک میرے لیے بھی بنا دینا۔ بھائی صاحب چائے کے رسیا معلوم ہوتے ہیں۔ اِن سے خوب یاری رہے گی۔'' قاسم چائے کے زیادہ شوقین نہیں۔ وہ آرام کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

جمعہ ۲۴ اکتوبر کی صبح وشال مجھے اور قاسم کو ''راک گارڈن'' دکھانے لے گئے جس کا تفصیلی ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے۔ وشال اور میں نے صبح اٹھ کر پنچکلا کا پیدل چکر بھی لگایا۔ ہمارے واپس آنے تک قاسم بھی بیدار ہو چکے تھے۔ نوجوت بھابی ملازمہ کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ باورچی خانے سے متصل ڈائننگ روم میں بڑے سلیقے سے سجی میز پر بیٹھتے ہی آلو کے گرم پراٹھوں، ترکاری، چکن کے سالن اور اچار سے شروع ہونے والا لذیذ ناشتہ چائے کے دور پر ختم ہوا۔

راک گارڈن جاتے ہوئے راستے میں وشال سے بڑی دلچسپ گپ شپ رہی۔ پہلی ملاقات کے ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی ہم تینوں اجنبیت، پردیس اور غیریت وغیرہ سے پیدا ہونے والے تکلفات سے آزاد اور عمر، رنگ، نسل، مذہب وغیرہ کے فرق سے بالا ہو کر گفتگو کرنے لگے تھے۔ وشال نے ہمیں اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا کہ مکینیکل انجینئرنگ مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایک دو پرائیویٹ فرموں میں ملازمت کی لیکن تنخواہ وغیرہ مناسب ہونے کے باوجود ملازمت میں جی نہ لگا۔ دوسری جانب نوجوت نے بھی بطور ڈینٹل سرجن سرکاری ہسپتال میں کچھ دیر کام کیا لیکن وہاں بھی آئے دن ٹرانسفر اور دیگر مسائل درپیش رہے۔ انہی دنوں وشال کو اپنے والد کی جانب سے پنچکلا میں ایک کمرشل پلاٹ ملا جس کے گراؤنڈ فلور پر انھوں نے دکانیں تعمیر

کر کے کرائے پر چڑھا دیں اور پہلے فلور پر نوجوت کے لیے ایک اچھا سا کلینک بنوا دیا۔ لیکن بظاہر میڈیسن اور انجینئرنگ کے شعبوں سے وابستہ اس جوڑے کی مشترکہ دلچسپی آرائش وزیبائش سے تھی جس کی بنیاد پر انھوں نے ایک انقلابی فیصلہ کر ڈالا۔ ملازمت چھوڑی اور کمرشل پلاٹ پر تعمیر شدہ گراؤنڈ فلور کی دکانیں ختم کر کے ایک بڑی گفٹ شاپ بنا کر دوسری منزل پر موجود کلینک نوجوت کے سابقہ کلاس فیلو کو کرائے پر دے دیا۔ وشال بولے کہ ہم دونوں میاں بیوی نے ابتدائی چند برس بڑی محنت سے کام کیا۔ نوجوت گھر اور دکان سنبھالتیں اور میں ہندوستان کے طول وعرض سے اینٹیک جمع کر کے ماہر کاریگروں سے اُنھیں قابلِ فروخت بنواتا۔ گھروں کی آرائش وزیبائش کی اشیا میں اتنی ورائٹی ہماری شاپ پر فراہم ہونے لگی کہ آنے جانے والے گاہک انٹیریئر ڈیزائننگ کے لیے بھی ہم سے مشورہ کرنے لگے۔ نتیجۃً نوجوت نے گھروں کے لیے پردوں، فرنیچر اور دیگر لوازم پر مشتمل ڈیزائننگ پیکج بنانے شروع کر دیے جن کی خوب پذیرائی ہوئی اور روز بروز مانگ بڑھنے لگی۔ گھر قریب ہونے کے باعث ہم میں سے ایک دکان پر ہوتا ہے اور دوسرا گھر یا باہر مارکیٹ میں۔ عموماً وشال صبح گفٹ شاپ کھولتے ہیں اور دوپہر کھانے کے لیے نسبۃً جلد گھر آتے ہیں۔ اُنھیں کھانا کھلا کر نوجوت شاپ پر چلی جاتی ہیں۔ لنچ کے بعد کچھ دیر ستا کر وشال دوبارہ دکان پر جاتے ہیں۔ گاہکوں کا زور عموماً شام کو زیادہ ہوتا ہے لہٰذا دونوں میاں بیوی چند گھنٹے مل کر دکانداری کرتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے وقت نوجوت گھر آ کر کھانا وغیرہ تیار کرتی ہیں جب کہ نو بجے کے قریب وشال بھی دکان بڑھا کر گھر لوٹ آتے ہیں۔

دوسروں کے گھر سجانے والے اس خوبصورت جوڑے کا اپنا گھر بھی بڑے قرینے سے آراستہ ہے۔ ذوق اور سلیقہ ہر شے سے ٹپکتے ہیں۔ دونوں بچے بھی اپنے ماتا پتا کی طرح مہذب اور پڑھائی میں تیز ہیں۔ اتفاق سے میرے دونوں بیٹے سرمد اور علی

بھی بالکل اِنہی کے ہم عمر ہیں لہٰذا مجھے ان کی تعلیمی کارکردگی اور کیریئر پلاننگ کے متعلق گفتگو میں خاصی دلچسپی رہی۔

ہفتے کی شام وشال ہمیں اپنی گفٹ شاپ پر لے گئے۔نوجوت بھی وہاں موجود تھیں۔ قاسم اور میں نے گراؤنڈ فلور اور بیسمنٹ پر مشتمل اس گفٹ شاپ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔کئی قسم کی مٹی، دھاتوں اور دوسرے میٹریل سے بنے ہوئے مجسمے، برتن، چھوٹے دیواری قالین، پردوں اور فرشی قالینوں کے نمونے، پینٹنگز، قسم قسم کی دستکاریاں غرضیکہ ایسی مختلف النوع اشیا موجود تھیں کہ جن سے گھر کا کونا کونا سج جائے۔ میں نے خوشبو دار موم بتیاں اور صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی کچھ اشیا خریدنے کے لیے الگ کیں۔ قاسم نے بھی کچھ چیزیں منتخب کیں مگر وشال اور نوجوت نے ان کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ تاہم یہ چیزیں واپس کر دینے کی ہماری محبت بھری دھمکی پر وہ ان کی قیمت لینے پر رضامند ہوگئے اور اِن چیزوں کے ساتھ اپنی جانب سے کچھ تحائف بھی ہماری نذر کیے۔

گھر واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے وشال بتانے لگے کہ گھریلو صنعت بالخصوص پرانے برتنوں پر اُس دور کے نقش و نگار کے حوالے سے زیادہ کام مرادآباد میں ہوتا ہے جہاں ان کا اکثر جانا رہتا ہے۔ اتفاق سے ثقافتی نوعیت کی اِن دستکاریوں میں بہترین مہارت رکھنے والے سب کاریگر مسلمان ہیں جو صدیوں سے یہ پیشہ نسل در نسل اپنائے ہوئے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس قسم کے نازک کام کے لیے جس مہارت اور فنکارانہ چابکدستی کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہی چند خاندانوں تک محدود ہے۔ وہ ہمارے بہترین بزنس پارٹنر ہیں۔ ہم ان کے ساتھ لاکھوں کا لین دین ہی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں بھی شریک ہوتے ہیں۔نوجوت کہنے لگیں کہ تقریباً ہر سال ہم عید کے نزدیک وہاں کا چکر لگا کر انھیں عید کے تحائف بھی پیش کرتے ہیں۔

وشال فیملی کے ساتھ اتنا جلد مانوس ہونے کی وجہ اُن کی پرخلوص میز بانی کے ساتھ مشترک زبان بھی تھی۔ ہمارے ہاں کے اکثر مڈل کلاس جوڑوں کی طرح یہ دونوں میاں بیوی بھی آپس میں پنجابی اور بچوں سے اردو (اُن کے لیے ہندی کہہ لیں!) اور انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں قیام کے دوران کھلی ڈلی پنجابی میں بات کرتے ہوئے یہی محسوس ہوا کہ لاہور یا پاکستانی پنجاب کے کسی دوسرے شہر میں مقامی فیملی کے ساتھ مقیم ہوں۔

قاسم اور مجھے سنگیت سمیلن کے پروگراموں کے لیے بھارتیہ ودیا بھون یا کھوسلا صاحب کے ہاں پہنچانے کی ذمہ داری بھی وشال کے سر تھی جسے انھوں نے بخوبی نبھایا۔ کبھی بچوں کو ٹیوشن سنٹر یا نوجوت کو گفٹ شاپ پر ڈراپ کرنا ہوتا تو ہم سب بڑی گاڑی میں سفر کرتے۔ مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو کرتے ہوئے بالکل فیملی کا ماحول معلوم ہوتا۔ قاسم اور میری جانب سے لاہور آنے کی دعوت کے جواب میں وشال نے بتایا کہ سیاحت ہماری فیملی کی پسندیدہ ترین تفریح ہے اور ہم سال میں ایک یا دو بار ہندوستان کے کسی سیاحتی مقام کا سفر ضرور کرتے ہیں۔ نیپال بھی جا چکے ہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے کہ پاکستان بھی جائیں کیونکہ لاہور اور راول پنڈی کے بارے میں بہت سن رکھا ہے۔

موہالی جانے کے لیے قاسم نے گھر پر ہی ٹیکسی منگوالی تھی۔ وشال، نوجوت اور میں نے اُنھیں صبح سویرے گیٹ پر الوداع کہا۔ نوجوت بھی بیٹے کو ٹیوشن کے لیے چھوڑنے نکل گئیں تو میں اور وشال سگریٹ سلگا کر لان میں پڑے بنچ پر بیٹھ گئے۔ سیاحت پر بات چل نکلی تو وشال نے بتایا کہ یونیورسٹی کے دنوں میں دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا ہوتا ہی تھا لیکن مجھے ہندوستان بھر کی سیر کروانے میں میرے لوّ افیئر کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے، تو بتانے لگے کہ نوجوت سے مجھے محبت طالب علمی کے

زمانے میں ہوئی۔ میں پٹیالہ سے انجینئرنگ کر رہا تھا جب نوجوت کو مدراس ڈینٹل کالج میں داخلہ ملا۔ یونیورسٹی کا سیاحتی ٹور کسی بھی جگہ کے لیے نکلتا، میں اُس میں شامل ہو جاتا اور اس جگہ پہنچ کر چپکے سے مدراس کی راہ لیتا۔ یوں میں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کو ٹرین، بس حتیٰ کہ سائیکل پر بھی گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ شادی کے بعد بھی ہمارا سیاحت کا شوق برقرار ہے۔ ہمارے پاس چار بہترین سائیکلیں ہیں جن پر ہم میاں بیوی اور دونوں بچے اکثر کسی نہ کسی ٹریک پر نکل جاتے ہیں۔

نوجوت کا تعلق سکھ فیملی سے ہے جب کہ وشال ہندو ہیں۔ گھر میں دونوں مذاہب کی مقدس کتابیں اور پوجا کا الگ الگ انتظام موجود ہے۔ قاسم اور مجھے جتنی اپنائیت اس فیملی سے ملی، ہم دونوں آج بھی اس کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا کرتے ہیں۔

◆◆◆

چنڈی گڑھ سنگیت سمیلن

۱۹۶۵ء سے ثقافتی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل ''انڈین نیشنل تھیٹر'' کے قیام کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد انڈین پنجاب میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بسائے جانے والے سب سے پہلے شہر چنڈی گڑھ میں ادبی وثقافتی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ شہری منصوبہ بندی کا عالمی شہرت یافتہ فرانسیسی آرکیٹیکٹ اگلے پچاس برس کی شہری ضروریات کے پیشِ نظر کھلی سڑکیں، مضبوط پل اور بلند و بالا عمارتیں تو ڈیزائن کر سکتا تھا لیکن اہلِ ہند کے فطری ذوق کی مناسبت سے فنونِ لطیفہ کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنا یقیناً اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ خوشگوار فریضہ یہاں کے باسیوں کو خود ہی انجام دینا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں فن وثقافت سے دلچسپی رکھنے والے چند خواتین وحضرات نے ''انڈین نیشنل تھیٹر چنڈی گڑھ'' کی بنیاد رکھی جس کے باقاعدہ افتتاح کے لیے معروف اداکار پرتھوی راج کپور خصوصی طور پر بمبئی سے چنڈی گڑھ تشریف لائے۔ خوش قسمتی سے اس تنظیم کو شروع ہی سے ایسے مخلص کارکنان کا تعاون اور سرپرستی حاصل رہی جن کی کوششوں کی بدولت پچھلے چالیس برس کے دوران ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے فنکار اس پلیٹ فارم سے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

''انڈین نیشنل تھیٹر'' ہر سال اکتوبر کے آخر یا نومبر کے آغاز میں ایک تین

روزہ سنگیت سمیلن کے علاوہ موسمی تہواروں مثلاً بہار اور برکھا رُت وغیرہ کے حوالے سے موسیقی اور رقص کے پروگراموں کا انعقاد کرتا ہے جن میں گذشتہ چار دہائیوں کے دوران استاد بسم اللہ خاں، پنڈت کمار گندھرو، استاد ولایت خان ستار نواز، کشوری امونکر، پنڈت بھیم سین جوشی، پروین سلطانہ، پنڈت جسراج اور پنڈت شوکمار شرما جیسے مایہ ناز فنکار تشریف لا چکے ہیں۔ ہمارے میزبان نوجیون کھوسلا، جن کا تفصیلی ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے، انڈین نیشنل تھیٹر کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ہی اس سے منسلک ہو گئے تھے اور تقریباً پچیس برس بطور اعزازی سیکرٹری کام کرنے کے بعد اب اس کے صدر ہیں۔ اُن کے ساتھ مجلسِ عاملہ کے گیارہ ارکان کے علاوہ محترمہ ونیتا گپتا اعزازی سیکرٹری اور خزانچی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ رام پور سے تعلق رکھنے والی ونیتا جی خود بھی بہت اچھا گاتی ہیں اور انڈین نیشنل تھیٹر کے زیرِ اہتمام موسیقی کے مختلف کورسز بھی کرواتی ہیں۔ اس وقت انڈین نیشنل تھیٹر کے ارکان کی تعداد ۲٦۸ ہے۔ ہوٹل اروما میں دیے جانے والے لنچ اور سمیلن کی نشستوں میں بیشتر ارکان سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔ سبھی لوگ فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ اکثر نے تو اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ انڈین نیشنل تھیٹر کو جالندھر کے تاریخی ہری ولبھ سنگیت سمیلن کی سطح پر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سینتیسواں سنگیت سمیلن

انڈین نیشنل تھیٹر چنڈی گڑھ کی چالیس سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ موسیقی کے حوالے سے ممتاز لوگوں پر مشتمل پاکستانی وفد اُن کے سالانہ سنگیت سمیلن میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر لاہور سے آیا تھا۔ سمیلن کی نشستوں میں شریک حاضرین، انڈین نیشنل تھیٹر کے ارکان اور اس موقع پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکاروں سے

تعارف کے بعد اُن کی جانب سے ملنے والی پذیرائی نا قابلِ فراموش تھی۔ لاہور کا ذکر سنتے ہی ہر فنکار کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ جاتی اور وہ برِصغیر کے ثقافتی دار الحکومت میں ایک بار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی تمنا ظاہر کرنے لگتا۔

چونکہ ہندو دھرم میں موسیقی عبادت کا جزو ہے لہٰذا اسے محض ایک فنِ لطیف سے کہیں بڑھ کر اہمیت دی جاتی ہے۔ موسیقی کی محفل کے خاص آداب ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہے: مثلاً یہ کہ جوتے سمیت کوئی شخص سٹیج پر نہیں جا سکتا؛ ہر فنکار کو سٹیج پر بلوا کر اس کی پرفارمنس شروع ہونے سے پہلے ایک تحفہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لیے حاضرینِ مجلس میں سے کسی معتبر شخص کو درخواست کی جاتی ہے اور یہ تحفہ اسے پرفارمنس کے بعد پیش کیے جانے والے طے شدہ اعزازیے سے الگ ہوتا ہے؛ فنکار بھی پرفارمنس شروع کرنے سے پہلے روایتی طور پر سب حاضرین سے اجازت لیتا ہے اور پرفارمنس کے دوران تالی بجا کر داد دینا انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم موبائل فون کی لعنت سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ پروگرام کے دوران اکثر حاضرین کے فون بجتے رہے۔

یہ تین روزہ سنگیت سمیلن بڑے ذوق اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ پہلے دو دن یعنی ۲۴ اور ۲۵ اکتوبر کو پروگرام کا وقت شام ساڑھے چھے بجے جب کہ تیسرے دن یعنی اتوار کو صبح ساڑھے دس بجے تھا۔ ہمارے ہاں عموماً ایسا نہیں ہوتا اور تین یا چار روزہ میوزک کانفرنسوں کے تمام پروگرام سرِ شام شروع ہو کر رات گئے تک جاری رہتے ہیں۔ گذشتہ پچاس برس میں موسیقی کے پروگراموں کی اس ترتیب کا ایک برا نتیجہ تو یہ نکلا کہ موسیقی کے شائقین تو دور کی بات، ہمارے بیشتر فن کار بھی صبح کے وقت گائے بجائے جانے والے راگوں کو تقریباً بھلا ہی بیٹھے! اسی لیے ہندوستان میں کسی سنگیت سمیلن کی عموماً تیسری یا آخری نشست اتوار کے دن قبل از دوپہر رکھی جاتی ہے جس میں فنکار وقت کی مناسبت سے صبح کے راگ پیش کرتے ہیں۔

پہلی نشست

سنگیت سمیلن کی پہلی شام دو فنکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا: اروندد ت شرما اور انو پما بھگوت۔

پرفارمنس شروع ہونے سے پہلے ہمارے وفد کی رکن ڈاکٹر غزالہ عرفان سیکرٹری آل پاکستان میوزک کانفرنس کو دعوت دی گئی کہ وہ فنکاروں کی عزت افزائی اور تحائف پیش کرنے کے لیے سٹیج پر تشریف لائیں۔ ڈاکٹر غزالہ نے سٹیج پر جا کر تمام فنکاروں کو خیر مقدمی ہار پہنائے اور انڈین نیشنل تھیٹر کی جانب سے تحائف پیش کیے۔ حیات احمد خان مرحوم کی صاحبزادی ہونے کے باعث اُنھیں بچپن ہی سے معیاری موسیقی سننے اور محافلِ موسیقی ترتیب دینے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہندوستان میں بھی موسیقی سے وابستہ اکثر لوگ اُن کے والد کے نام اور خدمات سے بخوبی واقف تھے۔

پنڈت اروندد ت شرما کا تعلق گوالیار گھرانے سے ہے۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد پنڈت رمیش چندردت سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے گندھرو مہاودیالیہ میں مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی یونیورسٹی سے موسیقی میں ایم اے اور ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد ازاں ڈاکٹریٹ کے لیے دہلی یونیورسٹی کو پیش کیے جانے والے آپ کے تحقیقی مقالے کا عنوان

Contributions of Saint Musician: Pandit Vishnu Digambar Pluskar

تھا۔ اِن دنوں آپ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ میں موسیقی کے پروفیسر ہیں اور اس سے پہلے بطور صدرِ شعبہ بھی فرائض انجام دے چکے ہیں۔

پنڈت جی نے سب سے پہلے راگ ''نند'' (آنندی کلیان) کا خیال پیش کیا۔ وِلمبت میں استاد امیر خان کی گائی ہوئی مشہور بندش ''بارے سیاں'' گائی اور وہ بھی ایکتالہ میں! استاد امیر خان نے یہ بندش جھومرا تال میں بڑے رچاؤ سے گائی ہے اور

اس کے رخنے گواہی دیتے ہیں کہ یہ بندش تال جھومرا میں ہی کمپوز کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں بھی چند فنکار اِسے ایکتالہ ہی میں گاتے ہیں۔ درت میں پنڈت جی نے تین تال لگوا کر ایک استھائی پیش کی جس کے بول تھے: ''اج ہن نہ آئے شام۔'' خود ہی بتایا کہ یہ استھائی انھیں ان کے گرو استاد یوسف حسین خان کی کلاس سے پرستت ہوئی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھے قاسم جعفری، پنڈت جی کی گائیکی سے متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: ''اِن پنڈت جی جیسا کوئی فنکار اپنے ہاں ہوگا؟'' میں چونکہ استاد امیر خان کا گایا ہوا آنندی کلیان ہزاروں نہیں تو سیکڑوں مرتبہ تو سن چکا ہوں لہٰذا میں نے اروند جی کی پرفارمنس پر بے لاگ تبصرہ کر دیا۔ ضمناً استاد امیر خان (۱۹۱۲ء-۱۹۷۴ء) کی فنی عظمت پر بھی ایک دو نکات گوش گذار کر دیے۔ قاسم سمجھ گئے کہ جس نے استاد امیر خان کو توجہ سے سنا ہوا ُسے پنڈت جی کی یہ نقالی کہاں پسند آ سکتی ہے؟ ویسے بھی اروند جی کے گانے میں آورد زیادہ اور تخلیقی اپچ کم تھی جسے میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا۔ میرے دہنی طرف بیٹھے کھوسلا صاحب، جنھوں نے استاد امیر خان کو متعدد بار سامنے بیٹھ کر سنا ہوا ہے، میرے تجزیے سے متفق تھے۔ فرمانے لگے کہ پنڈت جی پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ میں موسیقی کے پروفیسر ہیں۔ موسیقی پر علمی دسترس خوب ہے لیکن گانے میں وہ رس نہیں جو ہماری موسیقی کی جان ہے۔ پھر بھی ہم اِن کی بزرگی اور فنِ موسیقی سکھلانے کے حوالے سے خدمات کے اعتراف کے طور پر اپنے پروگراموں میں دعوت دے دیتے ہیں۔

''نند'' یا ''آنندی کلیان'' کے بعد پنڈت جی اگلے راگ کے لیے ساز ملا چکے تھے۔ اب کے انھوں نے راگ تلک کامود کا خیال ''کوئلیا بولے امبوا کی ڈالریا'' پیش کیا۔ سچی بات تو یہ ہے میری رائے میں اُن کا یہ آئٹم بھی بے تاثیر ہی رہا۔ شاید اس وجہ سے کہ پنڈت وشنو ڈگمبر پلوسکر (۱۸۷۲-۱۹۳۱ء) سے منسوب یہ خوبصورت بندش بھی

اروند جی سے کہیں بہتر گائی جا چکی ہے۔

تلک کامود کے بعد پنڈت اروند جی نے بالترتیب راگ کلاوتی اور مالکونس میں خیال پیش کیے جن میں سے ایکتالہ میں بندھا ہوا کلاوتی کا درت خیال ''کر کے سنگھار'' نسبتاً بہتر تھا۔ یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ پنڈت جی کے ساتھ سٹیج پر اُن کے دونوں صاحب زادے بھی ''آوازیے'' کے طور پر موجود تھے لیکن مجموعی تاثر پھر بھی پھیکا ہی رہا۔

پنڈت جی کی پرفارمنس کا کل دورانیہ تقریباً سوا یا ڈیڑھ گھنٹہ رہا جس میں اُنھوں نے یہ سب چیزیں سنا ڈالیں۔ اس پر مجھے اپنے استادِ گرامی جناب بدرالزماں (تمغۂ حسنِ کارکردگی) سے سنا ہوا وہ واقعہ یاد آ گیا جب ۱۹۶۰ء کی دہائی میں استاد سلامت علی نزاکت علی انڈیا گئے۔ استاد امیر خان کے ہاں گانے کی محفل تھی۔ رات کا کھانا وغیرہ کھا کر دس گیارہ بجے محفل شروع ہوئی۔ سلامت علی خاں بتاتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں نے ایک یا دو خیال اور ٹھمری پیش کی جس میں تقریباً دو اڑھائی گھنٹے صرف ہوئے۔ اس کے بعد استاد امیر خان سے درخواست کی کہ وہ بھی کچھ سنائیں۔ چنانچہ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اُنھوں نے ہامی بھری اور گانا شروع کیا۔ نصف شب کے بعد کا وقت تھا۔ استاد امیر خان نے راگ بھاس چھیڑا اور بقول استاد سلامت علی خاں، اگلے چار گھنٹے تک وہ بھاس کے پانچ سروں سے کھیلتے رہے! بلاشبہ برِصغیر کی موسیقی میں جیسا مرصع گانا استاد امیر خاں کا ہے اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ فنِ شاعری کے بارے میں آتش کا یہ شعر کافی حد تک استاد امیر خاں کی گائیکی پر بھی صادق آتا ہے:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

پہلے دن کی دوسری پرفارمنس انوپما بھگوت کی تھی جن کی عمدہ ستارنوازی نے شام کا لطف دوبالا کردیا۔ اس مرتبہ سٹیج پر فنکاروں کو خیر مقدمی تحائف دینے کے لیے قاسم جعفری کو بلوایا گیا۔ جب انوپما جی سٹیج پر بیٹھ کر ستار ملا رہی تھیں تو کھوسلا صاحب نے بتایا کہ میں اس بچی کو پچیس برس سے سن رہا ہوں اور اس کا فن وقت گزرنے کے ساتھ نکھرتا جا رہا ہے۔ اناؤنسمنٹ کرتے ہوئے ونیتا جی بتا رہی تھیں کہ انوپما بھگوت نے ستارنوازی کے دو معروف گھرانوں ''میہر گھرانہ'' اور ''امداد خانی گھرانہ'' سے تعلیم پائی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں انھیں آل انڈیا ریڈیو کے زیرِ اہتمام نوجوان فنکاروں کے درمیان ہونے والے موسیقی کے مقابلے میں اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں انھیں 'سُر سرنگار پریشد' کی جانب سے ''سُر مانی'' کا خطاب بھی مل چکا ہے۔

ساز ملائے جا چکے تو انوپما جی نے بڑے خوبصورت لب و لہجے میں سب حاضرین سے اجازت لے کر راگ جھنجوٹی کا الاپ شروع کیا۔ ستار پر ہاتھ دھرتے اور پہلا سُر چھیڑتے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ خاتون واقعی ''سُر مانی'' ہے اور اسے یہ خطاب دینے والے کتنے سُر شناس لوگ ہیں۔

بدقسمتی سے جھنجھوٹی بھی اُن راگوں میں ایک ہے جن کا چلن کم از کم پاکستان میں عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مہدی حسن صاحب کی گائی ہوئی ''گلوں میں رنگ بھرے......'' یا استاد عبدالکریم خان اور بعد ازاں ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کی گائی ہوئی معروف ٹھمری ''پیا بن ناہیں آوت چین'' کے علاوہ شاذ ہی اِس راگ میں ترتیب دی گئی کوئی چیز سننے میں آتی ہے۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ کسی راگ میں ترتیب دی گئی ٹھمری یا غزل وغیرہ کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن راگ کی اپنی وسعت کا درست اندازہ تو اسے کلاسیکی موسیقی کی بڑی اصناف مثلاً خیال یا دھرپد میں پیش کرنے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا میں اسے اپنی کم نصیبی ہی کہوں گا کہ پچھلے پچیس برس کے دوران کسی پاکستانی فنکار سے مجھے جھنجھوٹی کا خیال سننے

کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب جو ستار پر اسے سننے کا موقع ملا تو میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔

انو پما جی نے تقریباً پچیس منٹ تک راگ جھنجھوٹی کو اِس خوبصورتی سے الاپا کہ باید و شاید! گائیکی انگ کی ستار نوازی میں راگ داری کے ایسے ایسے زاویے سامنے آ رہے تھے جنھیں محسوس کر کے بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔ جوڑ جھالے کو انو پما جی نے ایسے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے نبھایا کہ ہمیں ستار نوازی کے درخشاں مستقبل کی دلیل مل گئی۔ اگرچہ گمک والے حصے میں سُر کا وہ رچاؤ برقرار نہ رہ سکا تاہم مجموعی طور پر سنگیت سمیلن کے پہلے دن کا حاصل یہی پرفارمنس تھی۔

الاپ کے بعد انو پما جی نے مدھ لے ایکتالہ میں گت پیش کی۔ استاد عنایت خان مرحوم کی اس بندش نے انو پما جی کے پیش کردہ الاپ کا خوبصورت تاثر مزید گہرا کر دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک جاری رہنے والی اس گت میں سُر کی سچائی اور بولوں کی وضاحت کے ساتھ ہاتھ کی جو تیزی اور پھرتی دیکھنے میں آئی وہ انو پما جی کا ہی حصہ ہے۔

طبلے پر محمود خان صحیح طرح سے انو پما جی کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ لَے اُن کے ہاتھ سے بار بار اچھل رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ خالی دکھانا ہی بھول گئے۔ اس کو کسی طرح سے پورا کرنے کی کوشش میں ''چیپی'' لگائی لیکن پھر بھی بات نہ بنی تو سُر اترنے کا بہانہ کر کے طبلہ ملانے لگے۔ انو پما نے حد درجہ پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سُر کا دامن نہ چھوڑا اور نئے سے نیا ارادہ لے کر گت جاری رکھی۔ پندرہ سولہ منٹ کی گت کے دوران دو بار محمود خان کو ''بوجوہ'' طبلہ ملانے کی ضرورت پیش آئی لیکن ''سُر مانی'' کے نفیس ہاتھوں سے سُر کا ایسا رچاؤ قائم ہو چکا تھا جس سے پوری فضا معطر تھی۔

راگ جھنجھوٹی کے بعد انو پما بھگوت نے مشر پیلو میں دادرا پیش کیا اور اپنے دونوں آئیٹمز پر خوب داد سمیٹی۔

اگلے روز ہوٹل اروما میں دوپہر کے کھانے پر انو پما سے ملاقات ہوئی تو قاسم

اور میں نے اُن کی پرفارمنس کی ایک بار پھر تعریف کرتے ہوئے لاہور آنے کی دعوت دی تو بولیں: ''میں نے تیرہ برس کی عمر سے ستار سیکھنا شروع کیا تھا اور پچھلے بیس برس میں ہندوستان بھر کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے کئی ملکوں میں پرفارم کر چکی ہوں لیکن لاہور کے اہلِ ذوق کے سامنے ستار بجانے کی بڑی خواہش ہے۔'' میں نے قاسم سے کہا کہ انوپما جی کو لاہور بلوانے کی کوئی سبیل پیدا کیجیے تاکہ اِن کی بھی خواہش پوری ہو سکے اور ہماری بھی۔

سنگیت سمیلن کی افتتاحی نشست کے آغاز میں حاضرین کی تعداد خاصی معقول تھی۔ بھارتیہ ودیا بھون کے اس ہال میں تقریباً ڈھائی سو کرسیاں لگی تھیں جو پنڈت جی کی پرفارمنس سے پہلے پُر ہو چکی تھیں، تاہم پروگرام کے اختتام تک یہ تعداد تقریباً آدھی رہ گئی تھی۔

دوسری نشست

ہفتہ پچیس اکتوبر کو بھی دو فنکاروں شریمتی منجوشا پاٹل اور شری شونیک ابھیشیکی نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔

دراصل کلاسیکی موسیقی کا پروگرام ترتیب دینا عام روٹین کے پروگرام ترتیب دینے سے کافی مختلف ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ آرٹسٹ ''بھگتانے'' کے بجائے صرف دو یا تین فنکاروں کو موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ کھل کر اپنے فن کا مظاہرہ کر سکیں۔ پاکستان میں چونکہ کلاسیکی موسیقی سے وابستہ فنکاروں کو بڑے محدود مواقع میسر ہوتے ہیں لہٰذا وہ پندرہ بیس منٹ کی حاضری پر بھی اکتفا کر کے سٹیج پر اپنی چہرہ نمائی کروا ڈالتے ہیں۔

پروگرام مقررہ وقت پر شروع ہوا اور اس بار سٹیج پر آئے ہوئے فنکاروں کو خیر

مقدمی تحائف پیش کرنے کے لیے مجھے دعوت دی گئی۔

منجوشا پاٹل نے پرفارمنس شروع کرنے سے پہلے بتایا کہ وہ ''نولی انکل'' کی خصوصی فرمائش پر راگ بہاگ پیش کریں گی۔اس کے بعد حاضرین سے اجازت لی اور بہاگ کا خیال شروع کیا۔

۱۹۷۱ء میں پیدا ہونے والی منجوشا پاٹل کا تعلق مغربی مہاراشٹر کے ایک علاقے سنگلی سے ہے۔اُن کے والدین بھی موسیقی کے شیدائی ہیں اور انھوں نے اپنی بیٹی کا فطری میلان دیکھتے ہوئے اسے موسیقی کے میدان میں آگے بڑھنے میں ہر ممکن مدد دی۔ ایک مقامی استاد پنڈت چنتو بوا مہیسکر اور چند دیگر اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اِن دنوں پدم شری پنڈت الہاس کاشلکر سے استفادہ کر رہی ہیں۔ ہندی زبان وادب میں گریجویشن کے بعد انھوں نے شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور سے موسیقی میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی اور پچھلی دو دہائیوں سے ہندوستان اور بیرونِ ملک اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

راگ بہاگ شروع کرتے ہوئے کھرج بھرتے ہی مجھے منجوشا کی آواز کی رینج کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے بعض دوسرے فنکاروں کے برعکس ان کی آواز کھلی کھلی ہے۔ بہاگ جیسے خوبصورت راگ کے ساتھ آپ نے بھرپور انصاف کیا۔ طبلے پر اویربھو ورما تھے جنھوں نے ولمبت میں ایکتالہ بجاتے ہوئے ایسی ایسی گلکاری کی کہ بہاگ کا لطف دوبالا ہو گیا۔منجوشا نے خیال گائیکی کے تمام لوازمات کو بڑے احسن طریقے سے پیش کیا۔سرگم کے علاوہ بول تان اور آکار تان انتہائی خوبصورتی سے برابر کی لے میں پیش کیں۔ پھر ایکتالے کی دگن میں بھی سُر کا رچاؤ برقرار رکھتے ہوئے لے کاری میں مہارت دکھائی۔ درت تین تال میں پیش کیے جانے والے خیال کے بول نہایت دلنشیں تھے:

لٹ الجھی سلجھا جا رہے بالم
مورے ہاتھ میں مہندی لگی ہے
ماتھے کی بندیا اچٹ رہی ہے
اپنے ہاتھ لگا جا رے بالم
لٹ الجھی ....

درت کے بول خوبصورت تو تھے ہی لیکن استھائی کی تراش اُس سے بھی بڑھ کر تھی جسے منجوشا کی عمدہ ادائیگی نے چار چاند لگا دیے۔ تقریباً پون گھنٹہ جاری رہنے والی یہ پرفارمنس انتہائی شاندار تھی۔

بہاگ کے بعد منجوشا نے راگ سوہنی پیش کیا۔ تال روپک میں پیش کی گئی ولمبت استھائی کے بول ''جیارا رے کل ناہیں پڑت سگری رین'' تھے۔ پہلے آئٹم کی اتنی اچھی پیشکش کے بعد دوسرے آئٹم کو مزید غور سے سننا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ انھوں نے راگ سوہنی بھی خوب گایا مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ دوبارہ وہ غلطی سے راگ پوریا کی جگہ کہہ گئیں۔ دراصل پوریا، ماروا اور سوہنی تینوں راگوں کے سُر ایک ہی ہیں۔ گانے والے کی مہارت کا امتحان یہیں سے ہوتا ہے کہ وہ اِن سے کوئی ایک راگ گاتے ہوئے باقی دونوں کی چھب سے دور رہے۔ اِسی لیے شاید سوہنی زیادہ دیر تک نہیں گایا جاتا۔ بہرحال ولمبت کے بعد منجوشا نے درت تین تال میں راگ سوہنی کی معروف استھائی ''دیکھ دیکھ من للچائے'' پیش کی۔ اِس استھائی کے جتنے خوبصورت بول ہیں، اُتنی ہی عمدہ اُن کی پیشکش بھی رہی۔

راگ سوہنی کی یہ استھائی سن کر مجھے کئی برس پہلے اوا خر اکتوبر ہی کی ایک شام یاد آ گئی جب مجھے ریڈیو پر راگ پوریا گانا تھا۔ جسمانی طور پر بھارتیہ ودیا بھون، چنڈی گڑھ میں بیٹھے ہوئے میں ذہنی طور پر خسرو میوزک اکیڈمی، ملتان روڈ، لاہور پہنچ گیا

جہاں استادگرامی جناب بدرالزماں (تمغۂ حسنِ کارکردگی) مجھے ریاض کروا رہے تھے۔ پوریا گاتے ہوئے دو ایک بار غلطی سے میں سوہنی کی جگہیں کہہ گیا تو انھوں نے بہ کمال شفقت اِن دونوں راگوں میں فرق واضح کرتے ہوئے سوہنی کی یہی استھائی مجھے سنائی تھی۔ اس دوران اچانک خورشید احمد ہارمونیم نواز بھی آ گئے اور دوسرا ہارمونیم پکڑ کر سنگت کرنے لگے۔ استاد جی کوسُر کی ایسی چھایا ملی تو اُن کا موڈ نکھر گیا اور وہ کافی دیر تک یہ استھائی گاتے رہے۔ اس شام راگ سوہنی کا ایسا رچاؤ ہوا کہ چائے پینے کے بعد بھی پوریا کا ریاض نہ ہوسکا۔

منجوشا پاٹل نے ایکتالہ میں سوہنی کا تروٹ بھی پیش کیا جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا اور آخر میں حسبِ روایت ایک بھجن سنایا جس کے بول ''پایو جی میں نے رام رتن دھن پایو'' تھے۔ خیال کے بعد نیم کلاسیکی انداز میں پیش کیا گیا یہ بھجن بھی کمال کی چیز تھی۔

منجوشا پاٹل کے بعد اس شام کے دوسرے فنکار شونیک ابھیشیکی سٹیج پر تشریف لائے اور راگ جے جے ونتی سے پرفارمنس کا آغاز کیا۔ شونیک کا تعارف کرواتے ہوئے ونیتا جی نے بتایا کہ وہ گذشتہ صدی کے معروف گائیک پنڈت جیتندر ابھیشیکی (۱۹۲۹ - ۱۹۹۸ء) کے بیٹے ہیں اور کلاسیکی و نیم کلاسیکی موسیقی کی تمام اصناف پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ جے جے ونتی کا خیال گاتے ہوئے انھوں نے ولمبت جھپتال اور درت ایکتالہ میں پیش کی لیکن، کم از کم میری دانست میں، کوئی خاص تاثر پیدا نہ کرسکے۔ اس کے بعد روپک تال لگوا کر تقریباً آٹھ دس منٹ تک راگ اڈانہ بھی گایا کیے لیکن اس راگ کے لیے گلے کی کم از کم تیاری سے بھی محروم دکھائی دیے۔

آخر میں شونیک جی نے کھوسلا صاحب کی فرمائش پر بھیرویں میں کمپوز کیا ہوا یہ بھجن سنایا:

شو کے من شرن ہو
اتنا تو کرنا سوامی
جب پران تن سے نکلے
چیھا پہ ہر بھجن ہو
جب سانس تن سے نکلے

کھوسلا صاحب نے بتایا کہ یہ مشہور بھجن شونیک کے والد پنڈت جیتندر ابھیشیکی بڑی عقیدت سے گاتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شو جی کی کرپا سے شونیک بھی یہ بھجن اچھا گا گئے ورنہ اس سے پہلے گائے جانے والے دونوں خیال درمیانے درجے ہی کے تھے۔

تیسرا دن

سمیلن کے تیسرے روز بھی دو فنکاروں کی پرفارمنس رکھی گئی تھی۔ اِن میں ایک تو دیبو پریا اور سچمیتا پر مشتمل بانسری نواز جوڑی تھی اور دوسرے ایشوینی دیش پانڈے تھیں۔

دیبو پریا نے مارچ ۲۰۱۴ء میں سنجن نگر سنگیت سمیلن لاہور میں بھی پرفارم کیا تھا اور اس موقع پر کھوسلا صاحب نے اُن کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا تھا کہ دیبو پریا اور سچمیتا دونوں بہنیں اکٹھا پرفارم کرتی ہیں مگر نجانے کیوں سچمیتا کو پاکستان کا ویزا نہ مل سکا لہٰذا لاہور میں دیبو پریا نے اکیلے ہی پرفارم کیا۔ خوش قسمتی سے میں اس موقع پر موجود تھا اور اُن کی انتہائی عمدہ پرفارمنس سے محظوظ ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ”آنچہ خوبان ہمہ دارند، تو تنہا داری“ کی مجسم صورت دیبو پریا کو دوبارہ سامنے بیٹھ کر سننے کا موقع کب ملے گا لیکن جب چند ماہ بعد سنگیت سمیلن کے لیے چندی گڑھ آنے کا امکان پیدا ہوا اور

دعوتی کارڈ میں اُن کا نام بھی دیکھا تو دعاؤں کے پورا ہونے پر یقین آ گیا۔ ہوٹل اروما میں لنچ کے موقع پر دیبو سے ہیلو ہائے ہوئی تو میں نے اُنھیں یہ ساری بات بتائی۔ اس موقع پر دیبو نے اپنی بہن سچسمیتا سے بھی میرا تعارف کروایا۔

سمیلن کے آخری روز یعنی اتوار کو پروگرام صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔ سب سے پہلے دیبو پریا اور سچسمیتا نے بانسری پر راگ آہیر بھیروں پیش کیا۔ الٰہ آباد سے تعلق رکھنے والی یہ دونوں بہنیں اس عہد کے عظیم بانسری نواز پدم وبھوشن پنڈت ہری پرشاد چورسیا کی شاگرد ہیں اور اوائل جوانی میں ہی ہندوستانی سنگیت میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ جگل بندی کے انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی بھرپور انڈرسٹینڈنگ سے پرفارم کرتی ہیں کہ بڑھت کرتے ہوئے راگ کی سچائی پر ذرا آنچ نہیں آتی۔ آہیر بھیروں کے طویل الاپ کے بعد جوڑ بھی اُسی خوبصورتی سے نبھایا۔ پھر دو بندشیں پیش کیں، ایک روپک میں اور دوسری تین تال میں۔ دونوں بہنوں نے بے ساختہ تانیں لیتے ہوئے ایسے برمحل بول پکڑے کہ لطف آ گیا۔ ہندوستان میں انھیں Flute Sisters کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اِن کے فن میں آورد کا شائبہ تک نہیں، سراسر آمد ہی آمد ہے۔ آہیر بھیروں کے بعد انھوں نے مشر دیس میں ایک دھن بھی پیش کی۔

اگلی پرفارمنس شروع ہونے سے پہلے انڈین نیشنل تھیٹر کے سینئر رکن ڈاکٹر وی سی نندا اسٹیج پر تشریف لائے اور لاہور سے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اپنی گفتگو کا آغاز رئیس امروہوی کے خوبصورت اشعار سے کیا اور پھر کوئٹہ میں گزارے ہوئے بارہ برس کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے رہے۔ اس بات پر افسوس کا بھی اظہار کیا کہ جس طرح پاکستان کی نئی نسل تاج محل دیکھنے سے محروم ہے، اسی طرح ہمارے بچے بھی ہم سے مری اور کوئٹہ کی صرف باتیں ہی سن سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نندا نے ماضی کی یادوں سے لبریز اپنی گفتگو پنڈت ہری چند اختر کی ایک نظم پر ختم کی۔ اس کے بعد انڈین نیشنل

تھیٹر کے ایک اور سینئر رکن انیل نہرو نے لاہور سے آئے تمام مہمانوں کو اپنی تنظیم کی جانب سے تحائف پیش کیے۔

ایشوینی دیش پانڈے کا تعلق جے پور اترولی گھرانے سے ہے۔ آپ نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ شریمتی مانک بھیڑے سے حاصل کی جو اپنے دور کی معروف مغنیہ تھیں۔ سولہ برس کی عمر میں گندھرو مہاودیالیہ سے سنگیت وشارد مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۱۹۷۷ء میں آل انڈیا ریڈیو سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا اور اس دوران اپنے گھرانے کے اساتذہ سے کسبِ فیض کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ نتیجتاً بلاتخصیصِ زن و مرد آپ کا شمار عہدِ حاضر کے بڑے گویوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں فن کا مظاہرہ کر چکنے والی ایشوینی جی کو متعدد ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے لیکن ان کی شخصیت کے حوالے سے دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ایشوینی موسیقی نہیں بلکہ بائیوکیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں۔

بارہ بجے سے کچھ اوپر کا وقت تھا جب ایشوینی جی سٹیج پر تشریف لائیں اور ایسے سُچے آکار اور رسیلی آواز میں راگ جونپوری کا آغاز کیا جو ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ مدھ لے تین تال میں ولمبت خیال کے بول بھی صوفیانہ تھے: ''سلطان اولیا پیر مان!'' درت تین تال میں آپ نے دو بندشیں پیش کیں: پہلے ''جھولت ہنڈول سکھیاں سنگ'' اور دوسری ''پایل باجن لاگی موری۔'' تقریباً پچاس منٹ جاری رہنے والا یہ آئٹم سمیلن کا حاصل تھا۔ میں نے پہلی قطار میں اپنے ساتھ بیٹھے کھوسلا جی کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہ آپ کی محبت کے باعث ہم ایسا عمدہ سنگیت سن سکے۔

جونپوری کے بعد ایشوینی جی نے راگ ککب بلاول کا خیال پیش کیا۔ مدھ لے جھپتال میں اپنے گھرانے کے بزرگ استاد اللہ دیا خان کی ترتیب دی ہوئی بندش ''گھر آج دولہا'' کے بعد درت ایکتالہ میں ''سب مل گاؤ'' پیش کی جسے حاضرین نے

بے حد پسند کیا۔

ایشوینی دیش پانڈے کی خوبصورت پرفارمنس پر حاضرین کی داد و تحسین ابھی جاری تھی کہ انڈین نیشنل تھیٹر کے صدر اور ہمارے میزبان نوجیون کھوسلا مائیک پر تشریف لائے اور اپنے ادارے، لاہور کے آئے وفد اور حاضرین کی جانب سے ایشوینی کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی مختصر گفتگو میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایشوینی کی والدہ شریمتی مانک بھیڑے جو کشوری امونکر کی شاگرد تھیں، وہ بھی انڈین نیشنل تھیٹر کی دعوت پر کئی برس پہلے اسی ہال میں پرفارم کر چکی ہیں۔ بات ختم کرتے ہوئے کھوسلا صاحب نے ایشوینی جی سے درخواست کی کہ جونپوری اور ککب بلاول کی اس خوبصورت پیشکش کے بعد آپ حسبِ روایت ایک نیم کلاسیکی آئٹم تو سنائیں گی ہی لیکن اس سمیلن کا اختتام ایک ایسے بھجن سے کیجیے گا جیسا ہم نے مارچ میں سنجن نگر سنگیت سمیلن لاہور کے موقع پر کبیر کا بھجن گا کر کیا تھا جس میں سب حاضرین بھی شریک ہوئے تھے۔

چنانچہ ایشوینی جی نے پہلے کبیر کا ایک مشہور بھجن سنایا جس کے بول تھے:

اچھا جاپ جپو بھئی سادھو
سانسوں کی کر لو مالا!

رواداری اور انسان دوستی سے مہکتے اس خوبصورت بھجن کی پیشکش بھی اتنی ہی عمدہ تھی جس پر سب حاضرین نے بے پناہ داد دی۔ آخر میں انھوں نے کھوسلا صاحب کے حسبِ فرمائش بھجن سنانے سے پہلے انڈین نیشنل تھیٹر کا شکریہ ادا کیا جو ایک طویل عرصے سے سنجیدہ موسیقی کی ترویج میں مصروف ہے۔ پھر کہنے لگیں کہ آخر میں وہ نرسنھ مہتا کا لکھا ہوا مشہور گجراتی بھجن ''وشنو جان تینے کہیے جی، پیڑ پرائی جانے رے!'' سنائیں گی۔ حاضرین میں سے جو لوگ اُن کے ساتھ شریک ہونا چاہیں وہ سٹیج پر تشریف لے آئیں۔ چنانچہ لاہوری وفد کی نمائندگی کرنے کے لیے سنجن نگر کی سینئر ریسرچر اور ہماری ہمسفر ارم

-تو قیر، انڈین نیشنل تھیٹر کی سیکرٹری ونیتا گپتا اور بانسری نواز بہنوں دیبو پریا اور سچمیتا کے علاوہ حاضرین میں سے بھی چند خواتین و حضرات سٹیج پر جا بیٹھے۔ ایشوینی جی نے خوبصورت الاپ کے بعد بھجن کی استھائی اور پہلا انترا پیش کیا۔ ہولے ہولے سٹیج پر بیٹھے لوگ اور پھر حاضرین بھی زیرِ لب اس کورس کا حصہ بن گئے اور محبت، امن اور باہمی یگانگت کے ماحول میں سینتیسویں چنڈی گڑھ سنگیت سمیلن کا اختتام ہوا۔

سنگیت سمیلن کے تینوں دن فنکاروں کے ساتھ سنگت کرنے والے سازندوں کے ذکر سے پہلے ایک دلچسپ واقعے کا تذکرہ ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سٹیج پر آ کر پرفارمنس شروع کرنے سے پہلے ہر فنکار کو منتظمین کی جانب سے ایک خیر مقدمی تحفہ پیش کیا جاتا ہے۔ عموماً کوئی شال اور پھولوں کے ہاروں پر مشتمل یہ ہدیہ پیش کرنے کے لیے حاضرین میں سے کسی معتبر اور نمایاں شخصیت کو سٹیج پر آنے کی زحمت دی جاتی ہے۔ سمیلن کے پہلے اور دوسرے دن یہ سعادت قاسم جعفری اور راقم کے حصے میں آئی۔ تیسرے اور آخری دِن ایشوینی دیش پانڈے کو سٹیج پر بلانے کے بعد انڈین نیشنل تھیٹر کی سیکرٹری ونیتا گپتا جی نے انھیں تحائف پیش کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کو دعوت دی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ ''......اور اب میں بنیتی کرتی ہوں ہال میں بیٹھے ہوئے سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل (ریٹائرڈ) وی پی ملک سے کہ وہ سٹیج پر آئیں اور ہماری آخری کلاکار ایشوینی دیش پانڈے کو انڈین نیشنل تھیٹر کی جانب سے یہ چھوٹی سی بھینٹ پیش کریں۔'' ہلکی سی تالیاں بجیں اور عام سے کپڑے پہنے دوسری قطار میں بیٹھے ایک صاحب اپنی نشست سے کھڑے ہوئے۔ سٹیج کے قریب جا کر احتراماً جوتے اتارے اور سٹیج پر بیٹھے تمام فنکاروں کو انتہائی ادب سے تحائف پیش کرنے کے بعد واپس اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ جونپوری اور ککب بلاول گاتے ہوئے ایشوینی کو جن مقامات پر اُنھوں نے داد دی، اس سے اُن کی موسیقی دانی کا بھی خوب اندازہ ہوگیا۔ فوج کے اعلیٰ

ترین عہدے پر پہنچنے والا شخص ایسا ''کن رس'' بھی ہوسکتا ہے، یہ انکشاف میرے لیے بڑی خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

سنگیت سمیلن کے تینوں دن جن سازندوں نے فنکاروں کے ساتھ ہارمونیم، طبلے اور تانپورے پر سنگت کی اُن میں سے دو کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے: ایک تو طبلہ نواز اویربھوورما اور دوسری پارومیتا مکرجی جنھوں نے آخری روز ہارمونیم پر ایشوینی جی کی سنگت کی۔ اِن دونوں کے علاوہ بھی پرم جیت سنگھ نے طبلے اور پرمود مراٹھے نے ہارمونیم پر چند فنکاروں کے ساتھ سنگت کی لیکن کوئی یادگار تاثر نہ چھوڑ سکے۔

طبلہ نوازی میں پنجاب گھرانے کے شاگرد اویربھوورما کا تعلق پیشہ ور موسیقاروں کے خاندان سے ہے۔ مارچ ۲۰۱۴ء میں سجن نگر سنگیت سمیلن کے موقع پر آپ چندی گڑھ سے دیگر فنکاروں کے ساتھ لاہور آئے تھے اور سنگت کے علاوہ سولو طبلہ نوازی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ فنی مہارت کے ساتھ ساتھ حسین اور خوش مزاج بھی ہیں اور انہی خوبیوں نے آپ کو ساتھی فنکاروں میں ہردلعزیز بنایا ہوا ہے۔ لاہور اور چندی گڑھ دونوں جگہ میں نے یہ بات محسوس کی کہ مرکزی فنکار چاہے گویا ہو یا سازندہ، اس کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ اویربھو اُس کے ساتھ طبلے پر سنگت کریں۔ آپ کے والد پوَن کمار ورما اور دادا پنڈت پچھمن سنگھ بھی اپنے زمانے کے بڑے طبلہ نواز ہو گزرے ہیں جب کہ آپ کی والدہ شریمتی گندھرو ورما ریڈیو اور ٹی وی پر گاتی ہیں۔ میلبورن (آسٹریلیا) میں مقیم اویربھو کے بڑے بھائی بھی معروف طبلہ نواز ہیں۔

پرفارمنس میں وقفے کے دوران گپ شپ کرتے ہوئے میں نے موسیقی کا طالب علم ہونے کے ناتے اُن کے فن کی تعریف کی تو فنکارانہ عجز کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں تو بس اپنی سی کوشش کرتا ہوں، اوپر بھگوان اور نیچے گرو جی کی کرپا سے اچھا بج جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ طبلہ تو بہت لوگ بجاتے ہیں، سنگت بھی کرتے ہیں؛

وہی دھمار، ایکتالہ اور تین تال وغیرہ بجتے رہتے ہیں لیکن اگلا ماترا آنے تک اُس وقفے کو جس انداز میں آپ پُر کرتے ہیں، ہندو پاکستان کے نوجوان طبلہ نوازوں میں ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

ایشوینی دیش پانڈے کے سٹیج پر آنے سے پہلے اُن کے ساتھ سنگت کرنے والے فنکاروں کو بلایا گیا تو ہلکے سبز اور سنہری رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے گہرے گندمی رنگ کی فربہی مائل ایک خاتون تشریف لائیں اور ہارمونیم کے سُر چھیڑنے لگیں۔ اِن کے بارے میں بتایا گیا کہ پارو ییتا مکر جی کو صرف ایشوینی جی کی سنگت کے لیے ممبئی سے بلوایا گیا ہے۔ میں نے ساتھ بیٹھے وِوِک جی کو حیرانی سے دیکھا اور پوچھنے ہی والا تھا کہ اِن خاتون میں ایسی کیا بات ہے جو صرف ایک آرٹسٹ کی سنگت کے لیے خصوصی طور پر ممبئی سے چندی گڑھ آنے کی دعوت دی گئی ہے لیکن میرے پوچھنے سے پہلے ہی پارو ییتا جی ایک ہاتھ ہارمونیم کے سروں پر رکھ کر دوسرے سے آنس دینے لگی تھیں۔ جونپوری کے سُر ایسے متوازن انداز میں چھڑنے کی دیر تھی کہ مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ایشوینی جی کے دونوں راگوں اور بھجنوں میں پارو ییتا نے سُر کی ایسی چھایا کیے رکھی کہ بعض مقامات پر حاضرین کے ساتھ ساتھ خود ایشوینی بھی بے ساختہ داد دینے لگیں۔

اتوار کے روز سمیلن کی آخری نشست میں لاہور سے آئے ہوئے وفد کی جانب سے قاسم جعفری نے انڈین نیشنل تھیٹر کے اراکین اور تمام منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ برمحل اشعار اور موزوں الفاظ سے مزین اس خوبصورت گفتگو کو حاضرین نے بے حد سراہا۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد میں وِوِک اور وسّو کے ساتھ گھر واپس پہنچا تو کھانے کی میز پر بیلا، طارق جمیل، کھوسلا صاحب اور غزالہ عرفان کے ساتھ ایشوینی، دیپو اور پچسمیتا بھی بیٹھی تھیں۔ کھوسلا صاحب نے ان سے میرا خصوصی تعارف کروایا۔

کھانے کے دوران زیادہ تر گفتگو موسیقی پر ہی رہی۔ ''نولی انکل''، یعنی کھوسلا صاحب حسبِ معمول جانِ محفل تھے۔ سب نے ایشوینی جی کے گانے کی تعریف کی۔ ہر ایک تحسینی جملے کے جواب میں ایشوینی حد درجہ انکسار کا اظہار کرتی رہیں۔ ایک موقع پر کھوسلا صاحب بتانے لگے کہ ایشوینی کی والدہ بھی اسی طرح سادہ طبیعت اور دھیما مزاج رکھتی تھیں اور آج ایشوینی کو سنتے ہوئے مجھے چالیس پینتالیس سال پہلے اُن سے سنی ہوئی ایک ٹھمری یاد آ رہی تھی۔ پھر اُس ٹھمری کے بول گنگنائے تو ایشوینی بھی اپنی ماتا جی کو یاد کرنے لگیں۔

کھانے کے بعد چائے کے لیے سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تو میں نے ایشوینی اور دیوپریا کو اپنی کتاب Doyens of Subcontinent Music پیش کی:

چہ کند بی نوا ہمین دارد

◆◆◆

وِوِک اور وسّو

وسّو جی اور اُن کے شوہر وِوِک کا کافی ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ لاہور سے جانے والے وفد کی مہمانداری جس خلوص اور سلیقے سے اس خوبصورت جوڑے نے کی، وہ اپنی مثال آپ تھی۔

وسندھرا چوہان، جنھیں سب پیار سے ''وسّو'' کہتے ہیں، نوجیون کھوسلا صاحب کی بیٹی ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح تعلیم یافتہ، مہذب اور سلیقہ مند ہیں۔ لکھنے کا شوق بچپن سے ہے۔ زیادہ تر انگریزی اخبارات کے لیے کوکنگ کے موضوع پر کالم نویسی کرتی ہیں۔ آج کل روزنامہ ''دی ہندو'' میں باقاعدہ لکھ رہی ہیں جب کہ اس سے پہلے ایک اور انگریزی روزنامے ''میل ٹو ڈے'' سے وابستہ تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پکائے جانے والے کھانوں کے متعلق اُن کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع اور مستند ہیں۔ کہنے لگیں کہ میرے بعض کالم پاکستان کے روزنامہ ''دی نیوز'' کراچی میں بھی مکرر شائع ہوتے رہے ہیں۔

وسّو کے شوہر وِوِک بھارتی بھی بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ آج کل Pepsi Co (انڈیا) سے کارپوریٹ افیئرز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے طور پر وابستہ ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس اور دہلی سکول آف اکنامکس سے اکنامکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد ٹائمز آف انڈیا، اکنامک ٹائمز اور ہندوستان

ٹائمز جیسے بڑے اخبارات کے اداراتی عملے سے بطور ماہرِ اقتصادی امور وابستہ رہے۔ پھر ورلڈ بنک کے کنٹری ڈائریکٹر برائے ہندوستان کے مشیر کے طور پر کام کیا۔ کچھ عرصہ فیڈریشن آف انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری (FICCU) کے نیشنل پالیسی ڈویژن کے سربراہ بھی رہے۔

پٹیالہ کی راجپوت چوہان فیملی سے تعلق رکھنے والی پنجابی سپیکنگ وسندھرا اور آگرہ کے رہنے والے نکھری نکھری اردو بولنے والے وِوِک بھارتی کی جوڑی بھی خوب ہے؛ ایک تجارتی اور اقتصادی امور کا ماہر ہے تو دوسرا امورِ خانہ داری پر تحریر وتقریر میں بے مثال، مگر دونوں کی مشترکہ دلچسپی ایک ہے: ہندوستانی سنگیت!

سنگیت سمیلن کے آخری روز جب دیوپریا اور پچسمیتا نے سٹیج پر بیٹھ کر ساز ملانا شروع کیے تو تانپورے چھڑتے اور مائیک چیکنگ کے لیے بانسری میں پھونک پڑتے ہی میرے ساتھ بیٹھے وِوِک بولے: ''میرا خیال ہے یہ آہیر بھیروں بجائیں گی۔'' موسیقی کے حوالے سے اپنے محدود علم کی بنا پر مجھے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ بھیروں ہی کی کوئی شکل بجے گی لیکن وِوِک کی زبانی انتہائی اعتماد سے آہیر بھیروں کا نام سنتے ہی دیوپریا کی آواز کان میں پڑی: ''آپ سب مہان لوگ ہیں۔ ہم آپ کی آگیا سے راگ آہیر بھیروں پیش کریں گی''، تو مجھے فارسی کی یہ مشہور ضرب المثل یاد آ گئی:

آنچہ در آینہ جوان بیند
پیر در خشت خام آن بیند

◆◆◆

......تیرے گھر کی طرف دیکھتی چلے

۱۲۷ اکتوبر ۲۰۱۴ء صبح ساڑھے چھے بجے کا وقت ہے۔ کھوسلا صاحب—— سعدیہ، ارم، رشیدہ، ڈاکٹر غزالہ اور مجھے اپنے گھر سے باہر کھڑے رخصت کر رہے ہیں: "بس ٹرمینل یہاں سے تقریباً پینتیس منٹ کا راستہ ہے۔ آپ بڑی آسانی سے بس پکڑ سکیں گے۔ اِن چار دنوں میں آپ کو کوئی دقت ہوئی ہو یا مہمان نوازی میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو معاف کیجیے گا۔" جواباً ہم پانچوں کی آنکھیں اشکبار ہیں اور ہم باری باری اُن سے گلے ملتے ہوئے اُن کی پرخلوص مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

اتوار کے دن سنگیت سمیلن کی آخری نشست کے دوران قاسم، بھارتیہ ودیا بھون ہی سے جالندھر روانہ ہو گئے تھے جہاں انھیں کچھ دوستوں سے ملنا تھا اور پھر سوموار کو بارڈر کھلتے ہی لاہور پہنچ کر کوئی دفتری مصروفیت نمٹانا تھی۔ بیلا رضا اور اُن کے شوہر طارق جمیل، کھوسلا صاحب کے گھر کے بجائے ہوٹل میں رہ رہے تھے لہٰذا انھوں نے وہیں سے سیدھا بس ٹرمینل پہنچنا تھا۔

وشال نے پچھلے چار روز کی طرح آج بھی مجھے کھوسلا صاحب کے ہاں پہنچایا۔ اِس سے پہلے نوجوت بھابی نے علی الصبح اٹھ کر ناشتہ بھی کروایا۔ میں لاکھ کہتا رہا کہ مجھے ناشتے کی عادت نہیں صرف چائے یا کافی کا ایک کپ پیتا ہوں مگر وہ اسے میرا تکلف برتنا سمجھتے ہوئے چاروں دن بھرپور ناشتے کا اہتمام کرتی رہیں۔

آپ چنتا نہ کریں

کھوسلا صاحب کا ڈرائیور دیس راج اپنی گاڑی میں ہمارا سامان رکھتے ہوئے موبائل فون پر ہمارے لیے منگوائی گئی دوسری ٹیکسی کو جلد پہنچنے کی تاکید کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ ٹیکسی آ گئی اور ہم پانچوں کھوسلا صاحب اور وشال سے رخصت ہو کر چندی گڑھ بس ٹرمینل کے لیے روانہ ہو گئے۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ رشیدہ اکثر ہندوستان آتی جاتی رہتی ہیں لٰہذا اُنھیں یہاں کے سفری مسائل کا کافی تجربہ ہے۔ ٹرمینل پہنچنے سے پہلے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اُنھوں نے بڑی پتے کی بات کہی کہ امرتسر سے بارڈر تک جانے کے لیے بھی ٹیکسی کی بات اِسی ڈرائیور کے ذریعے کر لی جائے تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ میں نے یہ ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ڈرائیور سے ''مذاکرات'' کا آغاز کیا۔ ہریانہ سے تعلق رکھنے والے جواہر لعل جی لاہوری سواریوں کی ہر ممکن مدد کو تیار تھے۔ جھٹ موبائل فون نکالا اور امرتسر میں کسی ٹور آپریٹر سے مناسب کرائے پر ہمیں بس ٹرمینل سے اٹاری تک پہنچانے کی بات کر لی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا دوست ہمیں پہچانے گا کیسے؟ تو کہنے لگے کہ ڈرائیور کا نام اور ٹیکسی نمبر تو آپ ابھی نوٹ کر لیں۔ مزید یہ کہ آپ جس بس میں سوار ہوں گے، میں اُس کا نمبر بھی اپنے دوست کو فون پر بتا دوں گا۔ وہ خود آپ کو بس کے پاس آ کر ریسیو کرے گا اور سامان سمیت باہر کھڑی اپنی ٹیکسیوں تک لے جائے گا۔ آپ چنتا نہ کریں۔ یہ اُن کا روز کا کام ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ امرتسر کی مذہبی اور سیاحتی حیثیت کے پیشِ نظر وہاں ٹور آپریٹرز اور ٹرانسپورٹ کا نیٹ ورک خاصا بہتر ہے۔

چندی گڑھ بس ٹرمینل پہنچ کر گاڑیوں سے سامان اترواتے ہوئے کچھ دور بیلا رضا اور طارق جمیل بھی ایک ٹیکسی سے اترتے دکھائی دیے۔ کھوسلا صاحب کے ڈرائیور

دیس راج نے ہمارا سارا سامان قلیوں کی مدد سے بس پر رکھوایا اور سب سے فرداً فرداً نمسکار کرتا ہوا رخصت ہوا۔

گزرے تھے ہم جہاں سے

تاج ٹریولز کی اس مرسڈیز بس کی سیٹیں خاصی کشادہ اور آرام دہ تھیں۔ ایئر کنڈیشنر بھی خوب کام کر رہا تھا اور صفائی کا معیار بھی مناسب تھا۔ اگرچہ امرتسر تک راستے میں آنے والے تمام چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں وغیرہ کے لیے سواریاں چڑھانے اور اتارنے کا سلسلہ جاری رہا تاہم مجموعی طور پر سروس اچھی ہی رہی۔

اپنے مقررہ وقت سے بیس منٹ لیٹ روانہ ہونے پر بھی بس کی تقریباً آدھی سیٹیں خالی تھیں۔ ہم سب اپنے سیٹ نمبر کے مطابق بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کی سیٹ کے نزدیک لگی درمیانے سائز کی ایل سی ڈی پر گرنتھ صاحب کا پاٹھ چل رہا تھا تاہم آواز زیادہ اونچی نہ تھی۔ جالندھر تک یہی عبادتی ماحول رہا لیکن اس کے بعد امرتسر تک مقامی پنجابی گانوں کی ویڈیوز لگا دی گئیں۔

بس چلنے میں تاخیر ہوئی تو سعدیہ پریشان ہونے لگیں کہ امرتسر سے آگے اٹاری تک بھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ اگر مناسب وقت تک نہ پہنچے تو بارڈر کراس کرنے میں دشواری ہو سکتی ہے۔ اس پر رشیدہ بولیں کہ انڈیا میں ٹرین لیٹ نہیں ہوتی، بسیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ اگر ایک بجے تک بھی امرتسر پہنچ گئے تو دفتری اوقات کے دوران بارڈر کراس کر لیں گے۔ بس چلی تو تھوڑی دیر بعد بیلا نے اپنی نشست کے اوپر سامان رکھنے والی جگہ سے ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھایا اور جس ہوٹل میں ٹھہری تھیں وہاں کی بیکری سے تیار شدہ تازہ پیٹیز سب کو پیش کیں۔ طارق صاحب کے سفری بیگ میں سے Bisleri منرل واٹر کی چھوٹی بوتلیں برآمد ہوئیں جنھیں دیکھ کر

چار روز پہلے بارڈر کراس کرتے ہی للت شرما کا پیش کیا ہوا دیسی ناشتہ یاد آ گیا۔ اُس کے ساتھ بھی منرل واٹر کی یہی بوتلیں تھیں۔ چندی گڑھ اور پنچکلا قیام کے دوران اور اب امرتسر کو سفر کرتے ہوئے اشتہاری بورڈز وغیرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں Bisleri منرل واٹر کے مشہور برانڈز میں سے ایک ہے۔

چندی گڑھ سے امرتسر آتے ہوئے راستے میں آنے والے شہر، دیہات اور قصبوں میں سے اکثر کے نام پہلے سے ہی مانوس تھے۔ کچھ مناظر اس لیے بھی آنکھوں میں محفوظ تھے کہ ابھی چار دن پہلے تو یہاں سے گزر ہوا تھا۔ قریب بیٹھے مسافروں کی باتوں اور بس عملے کی آوازوں میں بھی روپ نگر، کرالی، سرہند، روپڑ، نواں شہر، جالندھر اور کرتار پور وغیرہ کے نام ہی کان میں پڑ رہے تھے۔ میں زیادہ وقت اپنے سفری نوٹس مکمل کرتا رہا تاہم چندی گڑھ، جالندھر اور پھر امرتسر کے بس ٹرمینلز پر آویزاں پارکنگ ریٹ میرے لیے خاصی دلچسپی کا باعث رہے۔ ان تینوں بس ٹرمینلز پر سائیکل، موٹر سائیکل یا سکوٹر اور کار کے لیے پارکنگ فیس بالترتیب دو، تین اور پانچ روپے اور شاید ایک جگہ سائیکل اور موٹر سائیکل کے لیے دو اور کار کے لیے صرف تین روپے تھی۔ پاکستانی روپے کے مقابلے میں انڈین روپے کی قدر بہتر ہونے کے باوجود اس فیس کا لاہور میں اس نام پر جاری لوٹ مار سے موازنہ خاصا چشم کشا تھا۔

شملے والی

مسافر کم ہونے کے باعث دو سیٹوں والی نشست پر میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ جالندھر سے ذرا پہلے کسی قصبے سے کافی طالب علم ایک ساتھ بس میں سوار ہوئے۔ کچھ دیگر مسافر بھی تھے جن میں سے بیس اکیس برس کی ایک خاتون نے اشارتاً مجھ سے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت مانگی اور اپنا بیگ اوپر سامان والی جگہ پر رکھتے ہوئے

میرے ساتھ براجمان ہو گئیں۔ میں نے اخلاقاً اپنا تعارف کروایا: ''آئی ایم اطہر فرام لاہور۔'' جواباً بولیں: ''آئی ایم سواتی فرام شملہ۔'' ویسے 'آن را کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است' کے مصداق شملہ کا ذکر نہ بھی کرتیں تو معلوم ہو ہی رہا تھا۔ 'فردوس برروئے زمین' کے رہنے والے ہی ایسے خوش اندام اور حسین ہو سکتے ہیں۔ گفتگو چل نکلی تو پتہ چلا کہ وہ گرونانک دیو یونیورسٹی میں ملازم ہیں اور ویک اینڈ اپنے گھر گزارنے کے بعد سوموار کی صبح ڈیوٹی پر واپس جا رہی ہیں۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ سواتی جی کی ہم نشینی کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''ماں جی'' میں کشمیری عورتوں کے بارے میں لکھے ہوئے اُن کے جملے کی صداقت پر یقین آ گیا۔

ابھی تک کی زندگی میں ''اونچے شملے والے'' تو بہت دیکھے تھے، آج ایک ''شملے والی'' بھی دیکھ لی!

......لیکن اب نہیں!

جالندھر بس ٹرمینل پر تقریباً پندرہ منٹ رکنے کے دوران اکثر مسافر باتھ روم وغیرہ جانے کے لیے بس سے اترے۔ میں نے بھی بس سے نکل کر سگریٹ سلگایا اور اِدھر اُدھر گھوم کر ٹرمینل کا جائزہ لینے لگا۔

چنڈی گڑھ کی طرح جالندھر کا ''شہیدِ اعظم بھگت سنگھ انٹرسٹیٹ بس ٹرمینل'' بھی کافی بڑا تھا۔ بسوں کے ساتھ کھڑے کنڈیکٹر نواں شہر، پٹھان کوٹ، گورداسپور کی آوازیں لگا کر مسافروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ میں چشمِ تصور سے دیکھنے لگا کہ چند دہائیاں پہلے تک اس ٹرمینل پر پٹھان کوٹ اور گورداسپور کے ساتھ شکر گڑھ اور لاہور کی آوازیں بھی لگا کرتی ہوں گی، لیکن اب نہیں!

......ننکانہ ویکھن نوں!

ایک بجے کے قریب بس امرتسر ٹرمینل میں داخل ہوئی۔ بھیڑ، بدنظمی اور ناقص صفائی کے نمونے تو اس سے پہلے امرتسر شہر میں داخل ہوتے ہی نظر آ چکے تھے لیکن یہ ٹرمینل اِن تینوں حوالوں سے اپنی مثال آپ تھا۔ ٹرمینل میں داخل ہوتے ہی بس سے چپک جانے والے درجنوں قلی مسافروں کے اترنے سے پہلے ہی اُس پر یلغار کر چکے تھے۔ باوردی قلیوں کے درمیان کچھ سادہ لباس والے ڈرائیور نما لوگ بھی اس چھینا جھپٹی میں مصروف تھے۔ بس کمپنی کا ملازم روایتی بے پروائی سے سامان نکال نکال کر باہر فرش پر رکھتا جا رہا تھا۔ ہم اپنے اپنے بیگ پہچاننے کے لیے قریب پہنچے تو انہی عام لباس والے ڈرائیوروں میں سے ایک نے ہمارے سامان کو ہاتھ ڈالتے ہوئے گردن موڑ کر پوچھا: ''یو فرام جواہر لعل چندی گڑھ؟'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو اُس نے اپنے ایک ساتھی اور دو قلیوں کے ساتھ ہم سب کا سامان ایک بڑی ریڑھی میں رکھنا شروع کر دیا اور بولا: ''دونوں گاڑیاں باہر کھڑی ہیں۔ بڑی دیر سے انتظار کر رہا ہوں آپ کا۔'' پھر ساتھ کھڑی بسوں اور فرش پر بکھرے موبل آئل سے بچتے بچاتے ٹرمینل کے بیرونی راستے کی جانب ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ ٹرمینل سے باہر کھڑی ٹیکسیوں میں سامان رکھوا کر ہم نے قلیوں کو فارغ کیا اور دونوں ٹیکسیاں آگے پیچھے اٹاری کی جانب چل پڑیں۔

دوپہر کے وقت امرتسر شہر میں رش اپنے عروج پر تھا۔ ایک دو جگہ ٹریفک بلاک ہونے کے باعث واپس مڑ کر راستہ بدلنا بھی پڑا لیکن اس بہانے ہم نے امرتسر کی تھوڑی بہت بو باس محسوس کر لی۔ تقریباً ہر نمایاں جگہ پر دربار صاحب کو جانے والے راستے کی نشان دِہی کے لیے ہندی اور انگریزی زبانوں میں بورڈ لگے دکھائی دیے۔ ایک چوراہے کے وسط میں بڑے سے گول چکر پر سیاسی مظاہرہ ہو رہا تھا۔ میگا فون تھامے ایک نیتا جی نعرے بازی میں مگن سیکڑوں سیاسی کارکنوں سے بڑے پرجوش انداز میں خطاب فرما

رہے تھے۔کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ امرتسر کی یہی سڑکیں، بازار اور گلی کوچے ہیں جن کی یاد سے صوفی تبسم، اے حمید، ظہیر کاشمیری، سعادت حسن منٹو، احمد راہی اور شہزاد احمد کبھی دامن نہ چھڑا سکے۔

میں گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ڈرائیور نے چارج پر لگا اپنا موبائل فون اٹھا کر پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو راستہ سمجھایا کہ چھاؤنی کی طرف سے ہو کر نکلنا پڑے گا اور اگر سمجھ نہ آئے تو مجھے کال کر کے پوچھ لینا۔ پھر ڈرائیوروں کے روایتی انداز میں رش اور ٹریفک کے مسائل پر بڑبڑاتے ہوئے گاڑی ایک طرف کو موڑ لی۔

امرتسر کے اس علاقے سے گزرتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے پچیس تیس برس پہلے والے لاہور کینٹ کی سڑکوں سے گزر رہا ہوں لیکن جلد ہی ڈرائیور کے موبائل فون کی رنگ ٹون ''میرے نین ترسدے رہندے نیں ننکانہ ویکھن نوں......'' مجھے دوبارہ امرتسر میں لے آئی! پچھلی گاڑی کا ڈرائیور ہمارے ڈرائیور سے راستہ پوچھ رہا تھا۔ لاہور چھاؤنی اور امرتسر کے امتزاج سے ذہن کے پردے پر چلنے والی فلم کی پسِ پردہ موسیقی کے طور پر سکھ مذہب کے اس عبادتی گیت کے بول بڑے معنی خیز محسوس ہوئے۔

ڈرائیور کو ہمارے پاس وقت کی قلت کا احساس تھا لہٰذا اس نے رش کے باوجود رفتار میں کمی نہیں آنے دی۔ شہر سے باہر نکل کر ہم ایک جگہ کولڈ ڈرنک پینے کے لیے رکنے کے باوجود سوا دو بجے اٹاری کے امیگریشن آفس میں پہنچ چکے تھے۔ اتفاق سے وہاں بھی کاؤنٹر خالی تھے۔ سامان وغیرہ کی چیکنگ میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ پاکستانی وقت کے مطابق تقریباً ڈھائی بجے ہم بارڈر کراس کر چکے تھے۔

گھر ہے گھر پھر بھی

سجن نگر کی دو گاڑیاں واہگہ امیگریشن آفس کے باہر موجود تھیں۔ بیلا اور

طارق الگ گاڑی میں اپنے گھر روانہ ہوئے جب کہ رشیدہ، ارم، سعدیہ، ڈاکٹر غزالہ اور میں سنجن نگر آ گئے جہاں میرا ڈرائیور پہلے سے منتظر تھا۔ ڈاکٹر غزالہ کا اپنے ڈرائیور سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا جس پر میں نے انھیں گھر پہنچانے کی پیشکش کی۔

سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا کہ رضا کاظم بھی تشریف لے آئے جو اسلام آباد سے سپریم کورٹ کی پیشی بھگتا کر واپس آ رہے تھے۔ تھکن کے باوجود ہمیں الوداع کہنے کے لیے پورچ میں رکے رہے اور کھوسلا صاحب کے ذکر پر بڑی محبت کا اظہار کرتے رہے۔

صبح ساڑھے چھے بجے پنچکلا سے روانہ ہو کر راستے میں ڈاکٹر غزالہ کو گلبرگ میں اُن کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد سوا چار بجے میں اپنے گھر کیولری گراؤنڈ لاہور کینٹ میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

وہ کوچہ رو کش جنت ہو گھر ہے گھر بھی

◆◆◆◆◆



یہ سفر کیا ہے؟ یوں سمجھیے کہ اِس ایک مصرع کی خوشگوار تفسیر ہے۔

؎ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

مسافر نواز ایک سے بڑھ کر ایک۔ ہر مسافر نواز ایسا مہمان نواز کہ قدموں میں بچھا جا رہا ہے۔ دسترخوانوں کی کیا رنگا رنگی ہے...... ہر رنگ، ہر ذائقہ کے پکوان، مٹھائیاں، مشروبات۔ اِن پر دیوالی کی مٹھائیاں مستزاد۔ مٹھائیاں، ساتھ میں آتش بازی کی بہار...... اور پھر سنگیت سمّیلن۔ یہ سب کچھ اِس طرح بیان ہوا ہے کہ ایک پوری تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور یہ سارا نقشہ کتنا جیتا جاگتا ہے۔

محمد اطہر مسعود نے شاید سفر بہت کیے ہیں۔ اِس عمل میں اُن کا مشاہدہ بہت تیز ہو گیا ہے۔ وہ معمولی نشست و برخاست کو، مہمان نوازی کے روایتی طریقوں کو بھی اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ روایتی نہیں رہتے اور بیان کی تازگی سے اُن میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑتی نظر آتی ہے۔ ہاں تو اب وہ پورا شعر سن لیجیے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

جس جس ہوٹل میں قیام رہا، جس جس گھر وہ گئے، سمجھ لیجیے کہ یہ سارے ٹھکانے شجرِ سایہ دار تھے۔

سفر خوب، سفرنامہ خوب تر۔ سبحان اللہ۔ واہ وا۔

انتظار حسین

فکشن ہاؤس

ISBN 978-969-562-410-4

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

e-mail:fictionhouse2004@hotmail.com